

A full-page illustration of the character Dracula. He is depicted from the waist up, wearing a black high-collared coat with a red cape. He has pale skin, dark hair, and a serious expression. He is pointing his right index finger towards the viewer. He wears a red cravat and a gold chain with a large green gem. The background is a dark, smoky purple.

**PDFBOOKSFREE.PK**

# ڈرپکولا

جاوید بخاری



## پیش لفظ

قارئین کرام!

## فہرست

ایک بار پھر آپ کی خدمت میں پہلے سے بہتر اور اچھوتا دہشت ناک انتخاب لے کر حاضر ہوں۔ آپ نے جیسے پہلے میری دو کتب ”خوفناک کہانیاں“ اور ”ہیبت ناک کہانیاں“ کو سراہا ہے۔ میں ان کے لیے بے حد مشکور ہوں۔ انسان جب سے اس دنیا میں وارد ہوا ہے مادراء العقل اور مافوق الفطرت واقعات اس کے ساتھ درپیش ہیں۔ وہ ہمیشہ ان کی کھوج میں تجسس کا شکار رہا ہے۔ کبھی تو وہ ان کے ساتھ نبرد آزما ہو کر فتح سے ہمکنار ہوا ہے اور اکثر وہ ان کی تاب نہ لاتے ہوئے لقمہ اجل بنتا رہا ہے۔ جنات، بدروحیں، چھلاوے ایسی حقیقتیں ہیں جن کا مشاہدہ ہمیں زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ قدیم ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ جس کو پڑھ کر آج یورپی مستقر یقین محو حیرت ہیں۔ کوئی شخص عمر کی طوالت کے لیے انسانی قربانی کا رواج آج تک قائم رکھے ہوئے ہے تاکہ وہ حیات ابدی پالے اور کوئی شخص مال و زر کی ہوس میں مبتلا ہے۔ کوئی سانپوں کی پراسرار دنیا کا بے تاج بادشاہ بننے کا خواہشمند ہے تو کوئی جنات کی تسخیر کا متمنی ہے۔ کوئی عالم غیب کے لیے طرح طرح کے انوکھے واقعات رونما کرتا ہے تو کوئی ہندو دیوتاؤں کو قبضے میں رکھنے کا طالب ہے۔ اس جدید دور میں بھی اکثریت مافوق الفطرت واقعات پر نہ صرف یقین رکھتی ہے بلکہ ان میں سے بیشتر کے ساتھ کوئی نہ کوئی واقعہ بھی بیت چکا ہے۔ بہر کیف یہ خدائے پاک ذات کے پراسرار راز ہیں

|   |                  |     |
|---|------------------|-----|
| ☆ | دیباچہ           |     |
| ☆ | خونی ڈریکولا     | 9   |
| ☆ | عفریت محل        | 59  |
| ☆ | سرباموڑ کی ڈائن  | 99  |
| ☆ | خون پینے والا    | 137 |
| ☆ | آدم خور کا کروچ  | 143 |
| ☆ | بھٹکتی روح       | 152 |
| ☆ | ڈیکولا کی موت    | 163 |
| ☆ | بدروح کی بیٹی    | 177 |
| ☆ | بھیڑیا نما انسان | 193 |
| ☆ | انتقام           | 207 |

جن پر کبھی نہ کبھی روشنی ضرور پڑے گی۔ کتاب ”ڈریکولا“ قدرے مختلف ہے۔ اس بات سے تو سب آگاہ ہیں کہ ڈریکولا ایک خون پینے والا عفریت تھا جو کہ نازک اندام اور خور و شیرازوں کو اپنے دام الفت میں الجھا کر ان کے خون کا آخری قطرہ تک ان کے جسم سے نچوڑ لیتا تھا۔ اس کی سحر انگیز آنکھیں ہر کسی کو ساکن و جلد کر دیتی تھیں اور دوسرا شخص بے بسی کے عالم میں مرغِ بسل کی مانند تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ ڈریکولا کے کردار پر کئی مصنفین نے منفرد اور تحیر آمیز واقعات بیان کئے ہیں مگر ان میں (بروم اسٹوکر) کی کہانی نے بے حد شہرت پائی اور اس پر کئی فلمیں بنائی گئیں۔

”ڈریکولا دراصل کون ہے؟“

یہ سوال ایک طویل عرصے سے زیر بحث ہے۔ ڈریکولا کوئی فرضی کردار ہے یا کوئی حقیقت؟ اس سوال کا جواب پیٹر ٹریمین نے اپنی کتاب ”تحقیق ڈریکولا“ میں دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”میں پرانی کتابوں کی دوکانوں پر جانے کا شوقین نہیں ہوں اور یہ محض ایک اتفاق ہی تھا کہ میں شمالی لندن میں چیمپل مارکیٹ کی ایک دوکان میں داخل ہو کر پرانی کتب کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ اسی دوران میری نظر کاغذوں کے ایک بوسیدہ پلندے پر پڑی جو کہ ایک سرخ فیتے میں بندھے ہوئے تھے۔ میں نے اس مسودے کی ورق گردانی کی تو اچانک میرا جسم سنسنانے لگا اور حلق خشک ہونے لگا۔ جوں جوں میں اسے پڑھتا گیا، خون میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ میں نے دوکان کی بوڑھی مالکہ سے اس مسودے کی قیمت دریافت کی۔ میری آواز مجھے کانپتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ بڑھیا نے بے پروائی سے کہا۔ ”ایک پونڈ!“ اسے احساس تک نہیں تھا کہ وہ کتنی نایاب چیز کو زیوں کے مول بیچ رہی تھی۔ میں نے ایک پونڈ اس کے ہاتھ پر رکھا اور باہر کی راہ لی۔ میں نے گھر پہنچ کر مسودے کا بغور مطالعہ شروع کیا تو احساس ہوا کہ یہ بہت خراب انگریزی میں لکھا گیا تھا۔

اس میں املاء اور گرامر کی بے شمار غلطیاں تھیں۔ مسودے پر ”پروفیسر ابراہام وان ہیلنگ آف ایسٹر ڈیم“ کے دستخط ثبت تھے۔ اس سے پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ خوفناک کہانی ”ڈریکولا“ کے مصنف ”برام اسٹوکر“ نے اپنی داستان میں جس پروفیسر ابراہام کا تذکرہ کیا ہے وہ محض فرضی کردار ہے لیکن پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ وہ ایک جیتا جاگتا اور حقیقی انسان تھا۔ پروفیسر ابراہام نے مسودے کے آغاز میں لکھا کہ ”اپنے سفر روس کے دوران میں اسے بدنام زمانہ ”ڈریکولا“ کے بارے میں تحقیق کا موقع ملا جو پندرہویں صدی عیسوی میں ولاشیہ پر حکومت کرتا تھا۔ اسی سلسلے میں اسے ایک بوسیدہ مسودہ ملا جو اطالوی زبان میں لکھا گیا تھا اور اس پر 1480 عیسوی کی تاریخ درج تھی۔ اس مسودے کو پڑھنے کے بعد میں کئی دن ایک عجیب ذہنی کیفیت میں مبتلا رہا اور پھر میں نے اپنی ڈیج زبان میں اس کا ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ کوئی اس داستان پر یقین کرے گا یا نہیں لیکن مجھے احساس ہے کہ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اس انسان کے بارے میں جو مر کر بھی زندہ تھا اور انسانوں کا خون پی کر صدیوں تک زندہ رہا۔“

میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس سنسنی خیز داستان میں کہاں تک صداقت ہے؟ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ 1431 عیسوی میں موجودہ رومانیہ پر مشتمل سرزمین پر ایک شخص (ولاتے پر) نے جنم لیا تھا جو کہ ڈریکولا کے لقب سے مشہور ہوا تھا۔ رومانیہ کی زبان میں ڈریکولا کے معنی ہیں ”شیطان“۔ یہ شخص ڈریکولا ولاشیہ کی مملکت پر 1448 عیسوی میں حکمران رہا۔ ترکوں سے شکست کھانے کے بعد وہ روپوش ہو کر جنگی کارروائیاں کرتا رہا، یہاں تک کہ اس نے دوبارہ 1456ء سے لے کر 1462 عیسوی تک ولاشیہ پر حکومت کی۔

یہ بھی تصدیق شدہ امر ہے کہ ڈریکولا کے تین بیٹے تھے۔ ولاد، مے ہیل اور

## خونی ڈریکولا

ٹوٹی پھوٹی سڑک پر سیاہ رنگ کی بگھی جسے دو سفید گھوڑے کھینچ رہے تھے ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ کار میتھیا کا یہ علاقہ اپنے گھنے خوفناک جنگلوں کے علاوہ دلکش بڑے زاروں کی وجہ سے بے حد دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا لیکن اس علاقے کی سڑکیں اور راستے بے حد شکستہ حالت میں تھے اور ان کی ناہمواری کی وجہ سے اس علاقے میں ذرائع آمد و رفت محدود تھے۔ اسی لیے بہت کم لوگ ادھر کا رخ کرتے تھے۔ بگھی میں بیٹھے ہوئے چاروں مسافر بڑی بے چینی اور اضطراب سے پہلو بدل رہے تھے۔ بگھی پتھریلی اور ناہموار سڑک پر بری طرح اچھل رہی تھی اور دھچکے کھا رہی تھی۔ باہر شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ اگر ان لوگوں کو راستے کی خرابی اور اپنی تھکن کا علم

میں۔ تاریخ ان کرداروں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ کچھ نہیں بتاتی مگر پروفیسروان ہلسنگ کے حیرت انگیز انکشافات نے ان کرداروں کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ سر آر تھر کانن ڈائل نے شرلاک ہومز کی سیریز میں ایک طویل ناول ڈریکولا سے متعلق لکھا ہے جو کہ فلمایا جا چکا ہے اسی طرح جان برک، مارک گولڈون اور الیگزینڈر رائفل کے ناول ڈریکولا کے کئی چھپے گوشوں کو سامنے لاتے ہیں۔ اس کتاب میں ان مصنفین کے ناولوں کی تلخیص پیش ہے۔ آپ ڈریکولا کی شخصیت سے بھرپور واقف ہوں گے اور اس کی اسراریت اور پراسرار قوتوں سے آگاہ ہو سکیں گے ڈریکولا کے علاوہ بھی کئی دوسرے خوفناک کہانیاں آپ کی تفریح کے لیے پیش ہیں جن کو پڑھنے کے بعد آپ کے نہ صرف روگٹے کھڑے ہو جائیں گے بلکہ آپ مدت تک انہیں فراموش نہ کر پائیں گے۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد آپ اپنی رائے سے ضرور مطلع فرمائیں۔ میں منتظر رہوں گا۔ اس کتاب کی تیاری میرے محترم استاد محمد شاہجہاں (مرحوم) کی نگرانی میں شروع ہوئی تھی جو کہ نہایت علمی اور دور اندیشانہ طبیعت کے مالک تھے۔ میری اخلاقی اور علمی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ نومبر 99ء میں ان کے سائے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ ان کا دست شفقت سترہ برس تک میرے سر پر رہا۔ میری بے حد خواہش تھی کہ یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع ہوتی مگر ذات خدائے باری تعالیٰ کو شاید منظور نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے اور اپنے کرم و فضل سے نوازے۔ آمین

مخلص

جاوید بخاری

ہوتا تو وہ اس علاقے میں آنے کی بجائے اپنی چھٹیاں آسٹریا کے مشہور شہر ویانا میں ہی گزار لیتے، لیکن اب اوکھلی میں سر دیا تھا تو موصول سے گھبراتا لا حاصل تھا۔ بہر حال یہ سب کچھ دھرا چارلس کا تھا جس کے اصرار پر ان لوگوں کو یہاں آنا پڑا تھا۔

ان کے بدن کی ہڈیاں بری طرح دکھ رہی تھیں اور جوڑ جوڑ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ خدایا، یہ سفر جلدی ختم ہو تاکہ وہ کچھ دیر آرام کر سکیں اور تازہ دم ہو جائیں۔ وہ دل ہی دل میں چارلس کو بھی کوس رہے تھے جس کی وجہ سے ان کی تفریح کا موڈ غارت ہو گیا تھا۔ باہر تاریکی پھیل رہی تھی اور یہ بات اب بعید از قیاس معلوم ہو رہی تھی کہ اس تاریک راستے پر کوچبان کو راستہ صاف نظر آ رہا ہو گا۔

چند لمحوں بعد کبھی رک گئی اور اندر بیٹھے ہوئے مسافروں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ انجانے خوف اور دوسووں میں گھر گئے تھے۔ ان کے دل میں یہ خوف بار بار کروٹیں لے رہا تھا کہ وہ کہیں تاریکی میں راستہ تو نہیں کھو بیٹھے۔ ان جنگلوں میں گم تو نہیں ہو گئے۔ جہاں رات کا تو ذکر ہی کیا دن کے وقت بھی سورج کی کرنیں نہیں پہنچتی تھیں اور جو اپنے پر اسرار اور طلسمی واقعات کی وجہ سے مشہور تھے لیکن ان کے وہم اور شکوک بے معنی اور لا حاصل تھے کیونکہ وہ ایک سرائے کے قریب جا پہنچے تھے۔ کوچبان کو دیکھ کر نیچے اترا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ سرائے کا بورڈ دیکھتے ہی خوش ہو گئے کیونکہ دن بھر کی تھکن کے بعد بالاخر انہیں آرام و طعام کی سہولت میسر آ گئی تھی جو ان کے لیے کمر نعت سے کم نہیں تھی۔

یہ سرائے چھوٹی تھی لیکن سرائے کا مالک اپنے برطانوی مہمانوں کو خوش کرنے کے لیے تیزی اور تندہی سے مصروف کار نظر آنے لگا۔ وہ مہمانوں کے کمرے میں جا کر آرا کر کے لگے۔ گرم پانی فوری طور پر تیار کیا گیا اور پھر جتنی دیر میں یہ برطانوی سیاح نما د بکر تازہ دم ہوئے، کھانا لگایا جا چکا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جو بہترین قسم کے روسے کئے ہوئے بیروں اور شاندار سلاط پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ بڑے سے آتش دان کے گرد اکٹھے ہو گئے اور بہترین قسم کے قہوے کا دور چلنے لگا۔ سب لوگ گھل مل کر باتیں کر

میں مصروف تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دراصل ایک ہی خاندان کے ارکان ہوں۔ اعلیٰ قسم کے درجینیا تمباکو کی مکہ اور قہوے کی تیز خوشبو نے مل کر سرائے پر ایک خوابناک ماحول طاری کر دیا تھا۔ یورپ کے اس تفریحی دورے کا پروگرام چارلس کینٹ نے بنایا تھا۔ وہ شروع سے ایڈونچر اور سیر و تفریح کا دلدادہ تھا اور نت نئے تفریحی پروگرام بنانا اور نئی نئی مہمات سر کرنا اس کا دلچسپ اور محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اس نے سرائے کے مالک کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی جرمن میں گفتگو شروع کر دی اور دوستی کر لی۔ سرائے میں موجود چند اور لوگوں کو اپنے برطانوی مہمانوں سے بات چیت کرنا گوارا نہیں تھا۔ پھر بھی جب چارلس نے حسب عادت مسکراتے ہوئے انہیں قہوہ پینے کی دعوت دی تو وہ بھی زیر لب مسکرائے اور پھر گنگنے لگے۔ کچھ لوگ پائپ پی رہے تھے اور اس گھمگھمی میں بظاہر بڑی بے نیازی سے شامل نظر آتے تھے۔ پھر وہ لوگ جوا کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔

چارلس نے دوبارہ سکھ اچھالا۔ قسمت کی دیوی اس پر مہربان تھی۔ وہ دونوں بار ہی جیت گیا۔ اس کی جیت کے بعد دوسرے لوگوں میں جھنجھناہٹ شروع ہو گئی اور چارلس نے ماحول کی کشیدگی کے پیش نظر تقریباً ہر شخص کو شراب پلانے کی پیش کش کی اور ماحول پھر سے پرسکون ہو گیا۔ ہیلن کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔ یہی نہیں بلکہ خود چارلس کے بڑے بھائی ایلن نے بھی اپنی رائے محفوظ رکھی۔ وہ ناگواری سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا لیکن کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

کچھ دیر بعد ماحول کی کشیدگی ختم ہوئی۔ ایلن مسکراتے ہوئے اپنے بھائی چارلس کا کھیل دیکھنے لگا۔ چارلس نے بمشکل تمام ایلن اور اس کی جواں سال بیوی ہیلن کو اس مہم پر آنے کے لیے رضامند کیا تھا۔ چارلس اور ایلن کو باپ کے مرنے کے بعد ورثے میں تھوڑی سی جائیداد ملی تھی اور چارلس ”بابر“ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست“ والے مقولے پر عمل پیرا تھا۔ وہ زندگی میں کتنی ہی سے وقت گزارنے پر مرجانے کو ترجیح دینے والے لوگوں میں سے تھا اور ہمہ وقت اچھی اچھی چیزوں، تفریحات اور جابے جاعاشہ کا قائل تھا۔ اس کے برعکس اس کے بھائی ایلن کو اپنی حسین بیوی ہیلن کا ساتھ دینا پڑتا تھا جو کنبوس تو نہیں تھی لیکن کفایت شعار ضرور تھی اور یہی وجہ تھی کہ ایلن نے اپنی

بہت ہو چکی۔ اب تم یہ بچکانہ حرکتیں ختم کرو۔ اتنی فضول خرچی سے بھلا کیا فائدہ؟“  
چارلس نے سرد مری سے جواب دیا۔ ”مجھے اپنی خوشی سے مطلب ہے۔ لوگ کیا سوچ رہے ہیں مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ لوگوں کا تو کام ہی سوچنا ہے۔ پھر مجھے ان باتوں کا غم کیوں ہو؟“ پھر وہ اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”کیا تم بھی ہیلن کی طرح میری فیاضی کو ناپسند کرتے ہو؟“

ایلن مسکرا دیا۔ ”میرے پیارے بھائی! میں تو مدت ہوئی تمہارے متعلق یا تمہاری باتوں کے متعلق پسند یا ناپسند والی حد سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔“ ہیلن نے بڑبڑاتے ہوئے لقمہ دیا۔ ”بہر حال حماقت تو حماقت ہی ہوتی ہے۔“ ڈیانا بالکل خاموش رہی اور اپنی غماز آلود آنکھوں میں مستی کے ڈورے لیے بے حد نشیلی مسکراہٹ لبوں پر سجائے بڑے محبت پاش انداز میں چارلس کو دیکھنے لگی۔ چارلس نے ڈیانا کی آنکھوں کا خاموش پیغام پڑھ لیا تھا۔ وہ بولا۔ ”میرا خیال ہے رات بہت ہو چکی ہے۔ اب ہمیں سو جانا چاہئے۔“ اس کی یہ بات ہیلن کو بہت بھلی لگی کیونکہ آرام کی طلب اسے بھی ستا رہی تھی اور دوسری صبح پھر انہیں اسی تکلیف دہ سفر کی تیاری کرنے کے لیے خود کو جلد از جلد تازہ دم کرنا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ آرام انہیں اس قدر جلد میسر نہیں آ سکتا تھا۔

ابھی وہ لوگ ہال سے نکل کر اپنے کمروں کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ سرائے کا صدر دروازہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ یوں کھلا جیسے کسی نے اسے بھرپور ٹھوکرماری ہو اور سردیخ بستہ ہوا کا جھونکا ہال میں داخل ہوا۔ سرائے میں موجود تمام لوگوں کے جسم میں سردی کی لہری دوڑ گئی اور وہ سب خوفزدہ ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

دروازے کے عین پتپتوں بیچ ایک قوی ہیکل لمبا چوڑا راہب کھڑا تھا۔ اس نے تیزی سے اپنی عقابی نظریں چاروں طرف دوڑائیں۔ تیزی سے دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹے پھر بڑی بے نیازی سے سرائے کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔ کمرے میں ایک بار پھر آتش دان کی گرمی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ وہ تیزی سے آتش دان کی طرف بڑھا اور غرایا۔ ”مجھے ایک بوتل سرخ شراب کی شدید طلب ہے۔ سردیوں کی اس برفانی رات میں تو کوئی درندہ بھی باہر نہیں رہ سکتا۔“ یکایک اس کے سر سے کوئی چیز ٹکرائی۔ اس نے

جائیداد کا کچھ حصہ ہیلن کے اصرار پر ایک کاروبار میں لگا رکھا تھا اور مستقل منافع کا ایک ذریعہ بنا کر اپنی معاشی، مالی اور سیاسی پوزیشن خاصی مستحکم کر لی تھی اور وہ چارلس کی طرح نئی نئی دلچسپیوں اور ایڈونچر کی تلاش میں کوشاں نہیں رہتا تھا۔

ایلن کی شادی کو سات آٹھ برس گزر چکے تھے لیکن اس کی بیوی ایلن ابھی تک آج بھی پہلے روز کی طرح تروتازہ، شاداب اور شگفتہ نظر آتی تھی۔ اس کی عمر 26 سال تھی لیکن اس کی جلد شفاف اور بے داغ تھی۔ اس کا بدن کسا ہوا اور جنسی طور پر بے حد پرکشش تھا۔ وہ اپنے بالوں کی طرف خاص توجہ دیتی تھی جو بے حد گھنے، لمبے اور سیاہ تھے۔ وہ انہیں کس کے باندھا کرتی تھی اور اس کا چہرہ بے حد معصوم اور دلکش تھا۔ وہ اپنے پتلے پتلے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا کر چوستی رہتی تھی۔ چارلس اور ایلن نے اسے کئی بار ایسا کرنے سے منع بھی کیا تھا لیکن اب یہ چیز ہیلن کی عادت بن چکی تھی اور وہ مجبور تھی کہ ایسا کرتی رہے۔

چارلس کی بیوی ڈیانا جو اس سفر میں ان کے ہمراہ تھی، بڑی حسین، طرحدار اور خوبرو عورت تھی۔ وہ جنسی طور پر ہیلن کی طرح پرکشش اور سڈول تھی اور اس کا سینہ ابھرا ہوا اور ٹھوس تھا۔ چارلس اس وقت سرائے کے مسافروں میں بے دریغ قہوہ تقسیم کرنے میں مصروف تھا اور ہیلن اس کی اس فضول خرچی پر مسکرا رہی تھی جب کہ ڈیانا اسے پر ایک دلغریب اور حسین مسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور وہ بڑی دلچسپی سے اسے سیریک حیات کو قہوہ پیتے ہوئے اور دوسروں کو پلاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

ڈیانا کا بدن لوچدار اور گداز تھا اور اس کے کسے ہوئے جسم کی چاشنی اس وقت بھی چارلس کے دل و دماغ میں گھلی جا رہی تھی۔ ڈیانا نے بے تکلفی سے اپنا پیالہ آگے بڑھایا اور چارلس نے اسے ارغوانی رنگ کے کھولتے ہوئے قہوے سے بھر دیا۔ ہیلن نے بے بسی سے سر ہلایا۔ چارلس نے ڈیانا کی طرف دیکھا اور آہستہ سے مسکرا دیا اور ہیلن اپنی جگہ بے بسی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ اس کے علاوہ وہ اور کچھ بھی کیا سکتی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ سرائے میں قیام پذیر دوسرے لوگ اس وقت دل ہی دل میں چارلس کو احمق سمجھ رہے ہوں گے۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ وہ بولی۔ ”چارلس! بر



گزرجائے، اسے زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں۔ آرام، عیش و عشرت، سیر و تفریح، یہ سب کچھ سکون دل اور قرار روح کے لیے اشد ضروری ہیں۔“ چارلس اب راہب کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”فادر! اگر میرا خیال غلط نہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ زندگی کی گما گمبیوں سے بڑی رغبت رکھتے ہیں۔“

فادر شینڈور نے کہا۔ ”زندگی۔ زندگی قدرت کا بیش قیمت عطیہ ہے میرے بچے اور اس کے علاوہ بھلا کیا دھرا ہے زندگی میں۔ زندگی میں سکون اور عیش بے حد ضروری ہیں۔ جہنم کی آگ مرنے کے بعد انسان کی منتظر ہوتی ہے اور ویسے بھی تو زندگی ایک جہنم سے کم نہیں ہوتی۔“ اس نے داد طلب نظروں سے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا۔

ہیلن نے بے زاری سے ناک سکوڑی۔ فادر شینڈور نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اچھا تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میرے برطانوی مہمان یہاں کار میتھیا میں اس ٹھہرتے ہوئے موسم میں کیا کر رہے ہیں؟“

چارلس نے بڑی خوش اخلاقی سے اپنا اور دوسرے ساتھیوں کا مختصر سارسی تعارف فادر شینڈور سے کرایا۔ فادر نے نرمی اور خوش دلی سے گردن ہلائی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اور مجھے فادر شینڈور کہتے ہیں۔ میں کلین برگ کے سب سے بڑے گرجا کا پاروری ہوں اور آپ لوگوں کا حقیر خادم۔“ چارلس نے اپنے ذہن میں کلین برگ کے محل وقوع کی ایک مبہم سی تصویر بنانی چاہی لیکن وہ ناکام رہا۔ فادر نے اس کو تذبذب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے بچے! یہ جگہ یہاں سے کافی دور ہے۔ ہاں تو یہ بتاؤ کیا تم شکار کھیلنے کے دقیق ہو؟“ اس نے قیاس آرائی کی۔

چارلس نے جواب دیا۔ ”نہیں مجھے کوہ پیما کی کاشوق ہے۔ ویسے بھی مجھے سیاحت و قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے سے جنون کی حد تک عشق ہے۔“

”خوب، بہت خوب۔“ فادر شینڈور مسکرایا۔ اس کی صحت قابل رشک تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ”مجھے اپنے ساتھیوں سے یہی کہنا ہے کہ یہاں کے لوگوں کے بارے میں بری رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم چاروں وہاں کلین برگ آجاؤ اور چند دن دوسرے راہبوں کی پر لطف رفاقت میں بھی گزارو۔“

جھنجھلا کر اوپر دیکھا۔ وہاں کسی نے لسن کی ایک پوتھی سیاہ ڈوری سے باندھ کر لٹکا رکھی تھی۔ اس نے جنگلی پن سے بڑے دھیمانہ انداز میں اس ڈوری کو توڑ دیا اور لسن کی پوتھی اٹھا کر آتش دان میں جھونک دی۔

”احمق کہیں کے۔ خبیث بدروحوں، شیطانی خون آشام عفریتوں اور شیطان صفت درندوں کے علاوہ مافوق الفطرت طاقتوں سے سرائے کو محفوظ رکھنے کا یہ کیا دنیانوسی طریقہ ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے؟“

سرائے کا مالک کھکھیانے لگا۔ ”فادر۔ فادر شینڈور۔ پلیز۔ خدا کے لیے ہم پر رحم کیجئے۔“

وہ پھر غرایا۔ ”رحم۔ رحم۔ رحم۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر تم لوگوں کی کھوپڑیوں میں کیا بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ دس برس ہو چکے۔ اب یہ سب بدعتیں ختم ہو چکی ہیں اور انہیں اب تک بالکل ختم ہو جانا چاہیے۔“ ہال میں جہاں کچھ دیر پہلے آوازوں کا شور تھا، اب ایک روح فرسا خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فادر شینڈور نے شعلہ بار نگاہوں سے ہال میں موجود لوگوں کو گھورا اور دھاڑا۔ ”ابھی، ابھی یہاں آنے سے پہلے، صرف کچھ دیر پہلے ایک معصوم بچے کی لاش کو اس عذاب سے نجات دلائی۔ وہ لوگ کج نیت، عاقل اور بد بخت لوگ اسے جلا ڈالنے پر مصر تھے۔ میں کہتا ہوں آخر کب تک، کب تک لوگ یونہی دوسوسوں، ضعیف الاعتقادی اور توہمات کا شکار ہوتے رہیں گے۔ آخر ہمیں کب عقل سلیم سے کام لینا آئے گا۔“

سب لوگ خاموش تھے۔ یکایک پہلی بار فادر شینڈور کی نظر برطانوی باشندوں پر پڑی۔ اس نے بھرپور نظروں سے چاروں سیاحوں کا جائزہ لیا اور آہستہ سے احتراماً ڈیانا تعظیم کے لیے جھکا۔ وہ جواباً مسکرائی اور سر کے اشارے سے اسے سلام کیا۔ فادر شینڈور نے ہیلن کو بھی تعظیم دی لیکن وہ اس سے مس نہ ہوئی اور ٹکٹکی باندھے اس کی جانب دیکھتی رہی۔

چارلس نے حیرت سے راہب کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”زندگی میں سوا۔ دکھوں اور مصائب کے اور بھلا رکھا بھی کیا ہے۔ میں اسی لئے جو لمحہ بھی عیش و آرام۔“

فقیروں کی محفل بڑی چیز ہے  
کبھی آؤ ان محفلوں کی طرف

ہاں، ہم سب خلوص دل سے تمہارے لئے چشمِ راہ رہیں گے۔“ اس نے چارلس اور اس کے دوسرے تینوں مسافروں کی طرف دیکھا۔

چارلس کی باچھیں اس دعوت پر کھل گئیں۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ بھی ایک دلچسپ تجربہ ہو گا۔ اسے ہمیشہ نت نئے اور دلچسپ پروگرام بہت پسند آتے تھے۔ اس نے ابھی کچھ کہنے کے لیے نہ کھولا ہی تھا کہ ہیلن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سختی سے کہا۔ ”کلین برگ جانا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہے۔ ہم وہاں نہیں جاسکتے۔“

چارلس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اگر ہم ایک دن وہاں گزار لیں تو کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“ فادر کا دل رہ جائے گا۔“

ہیلن بولی۔ ”لیکن کل تو ہمیں جوزف سیاد جانا ہے۔“ فادر شینڈور چونک پڑا اور بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیتے ہوئے بولا۔ ”پھر تو میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو پروگرام فوراً اور برقیقت بدل لینا چاہئے۔“ ہیلن کے تن بدن میں جیسے چنگاریاں سی اُگ گئیں۔ ایلن نے بھی اسی لمحے ہیلن کا ساتھ دینا مناسب سمجھا اور نرمی سے بولا۔

”فادر! ہم سب آپ کے بے حد شکر گزار ہیں کہ آپ ہمیں کلین برگ آنے دعوت دے رہے ہیں اور ہم سب آپ کے اس خلوص کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ ہم نے یہاں آنے سے پہلے ہی اپنا پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔“ اس نے اپنی صفائی کرتے ہوئے معذرت چاہی۔

فادر شینڈور کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے خوف اور بے اطمینانی کی جھلک نمودار ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”میں آپ لوگوں کو کلین برگ آنے پر مجبور نہیں کرتا اور میں ہوں کہ میں آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف کہیں بھی جانے سے روک بھی نہیں لیکن میری ناقص رائے میں جوزف سیاد جانا ایک فاش غلطی ہوگی۔ یہ خیال ہی کسی جرم سے کم نہیں ہے۔ میں آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ لوگ جوزف سیاد ہرگز جائیں۔“ فادر نے نرم لہجے میں انہیں تنبیہ کی۔

ڈیانہ نے کہا۔ ”لیکن ہم نے تو سنا ہے کہ وہ بڑی خوبصورت جگہ ہے۔“ وہ وہاں جانے کے لیے مصر تھی۔ اس نے کہا۔ ”ویسے بھی فادر! آپ فکر نہ کریں ہم لوگ بہت تجربہ کار کوہ پیا ہیں۔ کیا وہاں بہت خطرناک اور دشوار گزار چٹانیں اور راستے ہیں؟“

چارلس نے پوچھا۔ ”فادر، کیا آپ اس علاقے کی مشکل سرزمین کی وجہ سے ہراساں ہیں؟“

فادر شینڈور نے چارلس کی بات سن کر اس کے بڑے بھائی ایلن کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میں صرف یہ جانتا ہوں کہ جوزف سیاد سے دور رہنا ہی تم لوگوں کے حق میں بہتر ہوگا۔“

ڈیانہ سے رہنا نہ گیا۔ وہ بخشش سے بولی۔ ”لیکن، آخر کیوں؟“

فادر شینڈور نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ”میرے بچو! اگر میں تمہیں ساری تفصیلات بتا دوں تو تم شاید میری باتوں کا یقین نہیں کرو گے۔ میں خود بھی کبھی توہمات اور دوسوئوں کا قائل نہیں رہا لیکن خطرے سے دور رہنا ہی بہتر ہوگا۔ جوزف سیاد دراصل بدروحوں اور خبیث شیطانی طاقتوں اور بد خصلت عفریتوں کا مسکن ہے اور مجھے ڈر ہے کہ اس معاملے میں وہاں کے رہنے والے لوگ بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ اس ملک میں اور بھی بہت سی سینکڑوں قابل دید اور خوبصورت، حسین مناظر دہائی جگہیں موجود ہیں۔ جہاں جاکر تم لوگ زندگی کا صحیح لطف اٹھا سکتے ہو، لیکن جوزف سیاد سے دور رہنا ہی اچھا ہے۔“ فادر کی باتوں میں صداقت جھلک رہی تھی لیکن چارلس نے بددلی سے کہا۔ ”تو گویا یہ چیز بھی اب ہمارے لیے ایک چیلنج بن گئی ہے۔“

فادر شینڈور نے اس کی بات کا کوئی جواب ہی نہیں دیا اور چلا یا۔ ”سرائے کا مالک ماں ہے؟“ سرائے کے مالک نے آگے بڑھ کر سراسیمگی کے عالم میں فادر کے ہاتھ سے راب کا جام لے لیا۔ وہ دھاڑا۔ ”اپنے آدمی سے کھو، میرا گھوڑا باہر تھان سے کھول کر لے آئے۔ رات گزرتی جا رہی ہے اور مجھے ابھی بہت دور جانا ہے۔“ پھر وہ چارلس، ڈیانہ، ن اور ہیلن کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اچھا، میرے بچو! یسوع مسیح تمہاری حفاظت کرے۔ ز تو یہی ہے کہ تم میری باتوں پر اور میری ہدایت پر عمل کرو لیکن اگر تم ایسا نہ بھی کر



سکو تو بھی قلعے کے قریب مت جانا۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“ اس نے نصیحت کی۔  
”قلعہ!“ ایلن نے حیرت سے دہرایا۔ ”نقشے میں تو قلعہ نام کی کوئی چیز سرے سے  
موجود ہی نہیں ہے۔“

فادر نے مضحکہ خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ضروری نہیں کہ جو چیز  
نقشے میں نہ ہو۔ اس کا وجود سرے سے نہ ہو۔ بہر حال تم لوگ قلعے سے دور ہی رہنا۔“ یہ  
کہہ کر فادر تعظیماً جھکا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ پھر سے مقفل کر لیا گیا اور  
دور رات کے سناٹے میں فادر کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز گونجتی ہوئی رفتہ رفتہ معدوم  
ہوتی چلی گئی۔

فادر کے جاتے ہی سرائے میں سرگوشیاں اور ہلکی ہلکی آوازیں ابھرنے لگیں۔  
یکایک ایلن نے سرائے کے مالک سے پوچھا۔ ”فادر نے جس قلعے کے متعلق بتایا تھا  
تمہیں معلوم ہے کہ وہ قلعہ کہاں پر واقع ہے؟“

سرائے کے مالک نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایلن کی طرف دیکھا۔ ”قلعہ۔ قلعہ  
کیا قلعہ۔ جہاں تک میرے علم میں ہے مجھے کسی قلعے کا پتہ نہیں ہے۔“ سرائے کے مالک  
نے بڑی بے اعتنائی اور سردمہری سے جواب دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا تھا  
جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ اس کے جھوٹ کی غمازی کر رہا تھا۔  
ڈیانہ نے چارلس سے کہا۔ ”ڈارلنگ! مجھے حیرت ہے کہ یہ کم بخت آخر اس  
خوفزدہ کیوں ہے؟“

چارلس نے کہا۔ ”خیر یہ کوئی بات نہیں۔ دراصل فادر شیڈور کی آمد نے اس  
دل و دماغ پر بہت گہرا اثر کیا ہے۔“ اس نے اپنی رائے ظاہر کی۔ ہیلن کا خیال تو  
انہیں ان فضول اور بے بنیاد باتوں پر دھیان دینے بغیر اپنا سفر جوزف سیاد کی طرف  
رکھنا چاہئے تھا۔ ویسے خود ہیلن خواہ مخواہ رسک لینے کی عادی نہیں تھی۔ چارلس  
ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنی گل اندام شریک حیات ڈیانہ کی طرف دیکھا۔ ار  
آتشیں بدن کی آج اور رخساروں کی دھیمی دھیمی آگ کی پلٹیں اس کے دل کے گہ  
کو چھو رہی تھیں لیکن ساتھ ہی ساتھ چارلس کا ذہن اس وقت جوزف سیاد و

کے وجود میں الجھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ”کون جانے واقعی وہاں کوئی قلعہ ہو گا بھی یا  
نہیں۔“ اس کا خیال تھا کہ انہیں شاید وہاں کوئی نئی اور دلچسپ مہم ضرور پیش آ سکتی  
تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ اگر ایسا ہو جائے تو کس قدر مزا آئے گا اور سفر کا لطف دو بلا ہو جائے  
گا۔ اس نے ڈیانہ کا گلہ بازو آہستہ سے تھما اور پھر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے میڑھیاں  
طے کر کے اوپر بیڈروم کی طرف چل دیا۔

○☆☆○

دوسرے دن علی الصبح ہی وہ لوگ سرائے سے چل دیئے۔ ایک بار پھر گھمے کا سفر  
شروع ہو گیا۔ کافی دور تک چلنے کے بعد کوچبان نے گھمے روک دی اور ان لوگوں سے اتر  
جانے کا اصرار کرنے لگا۔ چارلس نے احتجاج کیا۔ ”لیکن یہ بات تو صریحاً زیادتی ہے اور  
ہمارے معاہدے کے بالکل خلاف ہے۔ تم نے تو ہم سے کنٹریکٹ کیا تھا کہ تم ہمیں جوزف  
سیاد لے چلو گے۔ پھر آخر ہم یہاں کیوں اتریں۔ یہ بھی بھلا کوئی شرافت ہے؟“

کوچبان نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ ”تم لوگ وہاں تک پیدل بھی جاسکتے  
ہو۔ میں ایک انچ بھی گھمے آگے نہیں لے جاؤں گا۔“ چارلس کی قوت برداشت جواب  
دے گئی۔ اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ ایلن نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ وہ اور  
ایلن بضد تھے کہ کوچبان انہیں آگے لے جائے لیکن وہ کم بخت انہیں وہاں اتارنے پر مصر  
تھا۔ جھڑا جلد ہی سنگین نوعیت اختیار کر گیا اور خاصی تو تو میں میں کے بعد نوبت آخر اٹھا  
خنخ تک جا پہنچی۔

لیکن اس سے پہلے کہ مار دھاڑ شروع ہوتی۔ اچانک چارلس کی نظریں دور ایک  
پرانے قلعے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اس نے حیرت سے قلعے کی طرف دیکھا اور اشارہ کیا۔  
”وہ وہ دیکھو۔ قلعہ۔ وہ رہا قلعہ۔“ کوچبان نے یک لخت پلٹ کر دیکھا۔ اسی اثناء میں  
ہیلن اور ایلن قلعے کی طرف دیکھ جاتے تھے۔ چارلس نے کوچبان کا شانہ آہستہ سے  
تھپتھپایا۔ ”یہ۔ یہ کیا جگہ ہے؟“ کوچبان جان بوجھ کر انجان بننے لگا۔ ”کیا جگہ ہے کون سی  
جگہ؟“ وہ قلعے کی طرف سے نظریں چرا رہا تھا اور دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی دور ان  
چارلس نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسے گھسیٹ کر نیچے گرا لیا۔ وہ دونوں گھمے گتھا ہو

خدا خوفزدہ تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہماری جانیں اور مال محفوظ رہا کیونکہ وہ کوئی ڈاکو یا رہزن نہیں تھا۔" اب آہستہ آہستہ شام کے سائے ڈھل رہے تھے اور دور فاصلے پر قلعے کی چند کھڑکیوں سے چمکتی ہوئی روشنی تاریک رات میں ستاروں کی طرح ٹٹمرا رہی تھی۔ دور سے دیکھنے پر قلعے کی عمارت بڑی بوسیدہ اور پرانی نظر آتی تھی۔ دن کی روشنی میں چاہے قلعہ کیسا بھی لگتا ہوگا لیکن رات کی ہولناک تاریکی میں قلعہ خاصا بھیانک اور پراسرار نظر آ رہا تھا۔

چارلس نے کہا۔ "فادر شینڈور نے ٹھیک کہا تھا۔ قلعہ موجود ہے۔ یہ کوئی وہم یا نظر کا دھوکا ہرگز نہیں ہے۔"

ڈیانا نے پوچھا۔ "لیکن خدا معلوم ایسا کیا راز ہے جو ہر شخص اس قلعے کا ذکر آتے ہی پہلو تہی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ خود کوچبان بھی ہمیں یوقوف بنانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔"

ہیلن نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ فادر شینڈور کا خدشہ بے بنیاد ہرگز نہیں ہے۔ ہمیں اس قلعے سے دور رہنا چاہئے۔" چارلس نے چونک کر ہیلن کی طرف دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہیلن نے اپنی فطری خود سری اور ضدی طبیعت کے برعکس کسی دوسرے کی رائے کی تائید کی تھی۔ وہ حیرت سے ہیلن کی طرف دیکھنے لگا۔ خود ہیلن کی تائید اس کی شریک حیات ڈیانا بھی کر رہی تھی۔

چارلس نے خاموشی سے ایلن سے مشورہ کیا کہ اس معاملے میں اس کی رائے کیا ہے۔ ایلن نے جو ایسے معاملات میں زیادہ تر چارلس پر اعتماد کیا کرتا تھا، اس مرتبہ بھی خاموش رہا پھر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں رات قلعے سے باہر ہی گزارنی چاہئے۔" غالباً وہ بھی ایسے حالات میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ چارلس نے کچھ فاصلے پر بنی ہوئی کڑھارے کی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "میرا خیال ہے ہم رات کو یہاں آگ جلا کر شب بسر کر سکتے ہیں۔" ہیلن نے اس کی بات سن کر اطمینان کا اظہار کیا اور بولی۔ "یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا۔"

دونوں آدمیوں نے بھاری بھاری سوٹ کیس خود اٹھائے اور ہلکا ہلکا سامان خواتین

گئے اور چٹان کی ڈھلوان سے لڑھکتے ہوئے نیچے جا گرے۔

نیچے گرتے ہی کوچبان سنبھلا، اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے پلک جھپکتے ہی اپنے لباس سے ایک تیز دھار کا بڑا پھلدار شکاری چاقو نکال لیا۔ وہ اسے گھماتا ہوا چارلس کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر اس نے کیننگی، گھنیا پن اور سفاکی سے اپنے گندے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا، اب بہت ہو چکی۔ تم سیدھی طرح خواتین کو کبھی سے باہر نکالو، اپنا سامان اٹھاؤ اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔ ورنہ میں گھی نیڑھی انگلیوں سے نکالنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔" اس نے ایلن اور چارلس کو وارننگ دی۔ اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا جس نے چارلس اور ایلن کو اور خوف زدہ کر دیا تھا اور وہ اس کی درندگی اور وحشت کو نظروں میں تول رہے تھے۔

پھر انہوں نے سوچا کہ حالات کی سنگینی کے پیش نظر یہی مناسب ہوگا کہ وہ کبھی خالی کر دیں۔ ہیلن اور ڈیانا بھی کبھی سے اتر آئیں۔ چارلس کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا لیکن ڈیانا نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے کوچبان کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے چاقو کو دیکھ رہی تھی۔ کوچبان بجلی کی سی تیزی سے مڑا اور ایک چھلانگ مار کر کبھی میں جا بیٹھا۔ اس نے تیز دھار چاقو سے سامان کی ڈوری کاٹ ڈالی ایک ایک کر کے سارے سوٹ کیس سڑک پر آ کرے۔ کوچبان نے لگائیں سنبھالیں اور بولا۔ "میں کل صبح سورج نکلنے کے دو گھنٹے بعد پھر یہاں آؤں گا۔ میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا لیکن جو زف سیاد نہیں، یہاں سے واپس۔ ہاں بس شرط یہی ہے کہ تم لوگ اگر کل صبح تک زندہ مل گئے تو ورنہ پھر مجبوری ہے۔" وہ سفاکی سے مسکرا دیا۔

ہیلن اور ڈیانا نے خوف سے جھرجھری لی۔ ڈیانا نے چارلس کے بازو پر اپنی گرفت اور مضبوط کر دی۔ کوچبان نے چابک لہرایا اور گھوڑے ہنساتے ہوئے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ چند لمحوں میں دور ہوتی ہوئی کبھی ایک سیاہ دھبہ بن کر رہ گئی اور پھر اس کا کوئی نشان بھی باقی نہیں رہا۔ اب وہ چاروں اس دیرانے میں بے آسرا کھڑے تھے۔ چارلس نے کوچبان کے جانے کے بعد کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ تاریکی سے بے

کے سپرد کر دیا۔ پھر یہ چاروں چھوٹی سی چٹان سے ہوتے ہوئے اسی چوراہے کے قریب بنی ہوئی شکستہ جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ جھونپڑی کا دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔ چارلس نے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں کھلا۔ بالآخر اس نے اپنے شانے کا زور لگا کر دروازہ کھولا جو ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ جھونپڑی خالی تھی۔ ویران، اداس اور بے آباد۔ لیکن اس کے فرش پر ایک کونے میں خشک اور سوکھی لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا جیسے وہاں کسی نے ان کی آمد کے پیش نظر آگ کا انتظام کر رکھا ہو۔ چارلس نے اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے دونوں سوٹ کیس فرش پر رکھ دیئے اور خالی خالی نظروں سے جھونپڑی کا جائزہ لینے لگا۔

پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”میرا خیال ہے رات گزارنے کے لیے یہ جگہ بر محل اور مناسب ہے۔“ ہیلن نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے تو قلعے کے خیال سے ہی وحشت اور گھٹن ہو رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا، لیکن چارلس کچھ بے چین نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ”آخر یہ لوگ کیوں اتنے بزدل واقع ہوئے ہیں۔ قدرتی نظاروں سے اور قدرت کی حسین ترین دکش رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے کی بجائے جھونپڑی میں گھسے رہنے سے آخر کیا فائدہ؟“ وہ دل ہی دل میں بہت کڑھ رہا تھا اور اس کو چبان کو کوس رہا تھا جس کی وجہ سے وہ بجائے جوزف سیاد جانے کے اس ویرانے میں مقید ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ دانت پیس کر رہ گیا۔

سب لوگ اپنا سامان اٹھائے جھونپڑی میں آگئے۔ انہیں یہ سوچ کر کچھ سکون ہوا کہ اب وہ نسبتاً محفوظ جگہ پر ہیں۔ ڈیانا کا خیال تھا کہ انہیں آگ جھونپڑی کے بجائے باہر جلائی چاہئے لیکن ہیلن اور چارلس کو یہ خیال زیادہ اچھا نہیں لگا۔ ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر دور سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دینے لگی جو ہر لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ ایلن نے خوش فہمی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کوچبان نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے اور اب وہ ہمیں لینے آ رہا ہے۔“

ہیلن کی باجھیں کھل گئیں۔ اس ہولناک ویرانے میں جہاں دور دور تک آدمی کا نام و نشان نہیں تھا اس کا دم گھٹنا جا رہا تھا۔ وہ چاروں جھونپڑی سے نکل کر چوراہے کے

قریب کھڑے ہو گئے اور شام کے دھندلکے میں ادھر دیکھنے لگے جدھر سے آواز آرہی تھی۔ لیکن بالکل غیر متوقع طور پر انہیں ایک بگھی اس سمت سے آتی نظر آئی جدھر قلعہ واقع تھا۔ ڈیانا نے سم کر چارلس کا بازو تھام لیا۔ ڈیانا کا ہاتھ سرد ہو رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے مڑتی ہوئی سڑک پر سیاہ بگھی نمودار ہوئی جسے دو بے حد شاندار نسل کے سیاہ چمکدار گھوڑے کھینچ رہے تھے لیکن بگھی پر وہاں کوئی کوچبان موجود نہیں تھا۔ ہیلن کا حلق خوف سے خشک ہونے لگا اور اس کے ہونٹوں پر پپرچیاں بھنے لگیں۔ اس کے شوہر ایلن نے چارلس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے ہیں۔ کیا ہم انہیں روک سکیں گے؟“ یہ سنتے ہی چارلس نے جو ہمیشہ سے مہم جو واقع ہوا تھا۔ سڑک کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے۔ گھوڑے اس وقت کسی کمان سے نکلے ہوئے تیروں کی طرح برق رفتاری سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی خوبصورت ایالیں ہوا میں لہرا رہی تھیں اور مدہم روشنی کے باوجود ان کے سیاہ جسم لہراتے ہوئے چمکدار شیش ٹاگ کی مانند چمک رہے تھے۔ جو نئی دونوں گھوڑے بے قابو اور سرکش طوفانوں کی طرح چارلس کے نزدیک آئے۔ ڈیانا نے ایک دلخراش چیخ ماری اور بے قرار ہو کر چیخی۔ ”چارلس۔ چارلس۔ خدا کے لیے اپنے آپ کو بچالو۔“ وہ خوف سے بری طرح لرز رہی تھی۔

لیکن چارلس اپنی جگہ کسی چٹان کی طرح جم رہا۔ وہ بڑی بے خوفی سے گھوڑوں کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اسی دوران بگھی اس کے بہت قریب آ چکی تھی۔ پھر اچانک بگھی چارلس سے صرف ایک گز کے فاصلے پر آ کر رک گئی۔ گھوڑے ہنہانے لگے اور بار بار اپنے چمکیلے سم زمین پر مارنے لگے۔ چارلس نے آگے بڑھ کر ایک گھوڑے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اس کی لگائیں تھام لیں۔ ہیلن اور ڈیانا بڑی زور سے ہوتی تھیں۔ چارلس نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ یہ حالات بڑے غیر معمولی ہیں لیکن مجھے بڑی مایوسی ہوگی اگر اس سفر میں اور بھی حیرت انگیز اور دلچسپ واقعات پیش نہ آئے۔“

پھر اس نے سب لوگوں کو بگھی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ڈیانا اور ہیلن سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ یہ سب کچھ بڑا پراسرار، بڑا غیر معمولی اور بہت سنگین نظر آ رہا تھا

رات کی اس ویران تاریکی میں گھوڑے یوں بے خطر بغیر کسی روشنی کے تیزی سے موڑ کھینچے یوں آسانی سے آگے بڑھ رہے تھے جیسے ان کے سم ان راستوں سے اچھی طرح آشنا ہوں۔ پھر قلعے کی کھڑکیوں کی زرد روشنی قریب آنے لگی اور گمرے پانی سے بھری ہوئی ایک چوڑی خندق عبور کر کے گھوڑے بڑے وقار سے قلعے کے بہت بڑے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک بڑا سا صحن تھا۔ اب گھوڑوں کی رفتار آہستہ ہو گئی تھی اور پیسوں کی گڑگڑاہٹ میں بھی کمی آگئی تھی۔ آخر کار کبھی صدر دروازے کے سامنے رک گئی۔

ہر طرف ایک عجیب سی بھیاںک سوگوار خاموشی تھی اور سناٹا چاروں مسافروں کی رگوں میں سنسنی بن کر اترتا چلا جا رہا تھا۔ ایلن نے درشتی سے کہا۔ ”یہ سب کیا ہے۔ کیا ہو رہا ہے؟ تم ہمیں یہاں کیوں لے آئے ہو؟“ اس کے چہرے سے خوف اور دہشت عیاں تھی۔ چارلس نے جواب دیا۔ ”کون؟ میں۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ یہ میں نہیں لایا۔ یہ کام ان گھوڑوں کا ہے۔“ اس کے لہجے میں حیرت اور خوف کے اثرات نمایاں تھے اور یہ کہہ کر چارلس نے کبھی سے چھلانگ لگا دی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ قلعے کا مالک نجانے کیا آدمی ہو گا۔ پھر ان سب کی نگاہیں بڑے آہستہ دروازے پر جم گئیں۔ وہ جب آئے تھے تو رات کے سناٹے میں خاصا شور ہوا تھا لیکن یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ اب تک کوئی باہر نہیں نکلا تھا۔ کم از کم کسی کو تو باہر آنا چاہئے تھا۔ آخر کار چارلس نے خوش دلی سے کہا۔ ”آئیے خواتین! ہم سب اندر چلتے ہیں اور صاحب خانہ سے خود ہی مل لیتے ہیں۔“ ہیلن کو چارلس کا یہ آئیڈیا پسند نہیں آیا۔ اسے ان سب انسانی باتوں سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

چارلس دروازے کے قریب گیا تو ایک گھٹے نے زور زور سے اپنی ٹانگیں زمین پر مارنی شروع کر دیں اور بری طرح ہنسنے لگا۔ اس کے گلے کی نفرتی گھینٹیاں اور پاؤں کے طلائی گھنگھرو بجنے لگے۔ فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ پھر چاروں طرف وہی روح فرسا خاموشی چھا گئی۔ چارلس نے دروازے پر دستک دینی چاہی لیکن ابھی اس نے اس خیال سے ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ دروازہ ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ ہیلن جو

لیکن اس دور دراز اور پرہول سناٹے سے اور یہاں کی ہولناک ویرانی سے کہیں بہتر تھا کہ وہ لوگ کبھی میں بیٹھ جاتے۔ ہو سکتا تھا اس طرح وہ کسی سرائے میں جا سکتے اور یوں سفر کی کوفت، الجھن اور پریشانی کسی حد تک دور ہو جاتی۔ آخر چارلس نے فیصلہ سنا دیا۔ ”ٹھیک ہے، اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ آؤ سامان لادیں اور چلنے کی تیاری کریں۔“ اسے یقین تھا کہ ہیلن کے مقابلے میں ڈیانا زیادہ ہمت اور جرات کا مظاہرہ کرے گی اور فوراً کبھی میں بیٹھ جائے گی اور ہوا بھی یہی۔ ہیلن جھکتے ہوئے کبھی میں سوار ہو گئی۔ ایلن نے بھی چارلس کا ہاتھ بٹایا اور جلدی جلدی سارا سامان لکڑہارے کی جھونپڑی سے نکال کر کبھی میں رکھ دیا پھر وہ اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ چارلس نے لگائیں سنبھالیں۔ ایلن نے پوچھا۔ ”اب کہاں کے ارادے ہیں۔ جوزف سیاد؟“ اس کے لہجے میں یقین اور عزم و اعتماد جھلک رہا تھا۔

چارلس نے گھوڑوں کی لگائیں کھینچیں اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگے لیکن فوراً ہی چارلس کو اپنے بیوقوف ہونے کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ اس کی آنکھیں خوف اور دہشت سے ابل پڑیں۔ گھوڑے آہستہ آہستہ لیکن یقیناً اپنا رخ تبدیل کر رہے تھے اور بجائے جوزف سیاد کی سڑک پر جانے کے واپس قلعے کی طرف جانے والی سڑک پر سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ چارلس زور سے چیخا لیکن رات کی بڑھتی اور گہری ہوتی ہوئی تاریکی اور ہولناک سناٹے میں اس کی آواز زیادہ دور تک نہیں گونجی۔ اس کی چیخ اس کے لبوں تک آئی اور پھر حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ گھوڑے بہت تیزی سے سڑک کو روندتے ہوئے قلعے کی طرف بڑھ رہے تھے اور ان کے سموں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ ان کی رفتار لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ چارلس کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ ان جانوروں کا رخ تبدیل نہیں کر سکے گا۔ اس نے لگائیں چھوڑ دیں۔ لگائیں ڈھیلی ہونے کے باوجود بھی گھوڑوں کی رفتار کم نہیں ہوئی بلکہ وہ بدستور برق رفتاری سے بھاگ رہے تھے۔ چارلس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”ہو سکتا ہے قلعے کا مالک کوئی خوش اخلاق، نیک اور رحمدل آدمی ہو۔“ وہ ان حالات میں بھی امید کا دامن چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

ریلے فرش پر گھوڑوں کی ٹاپیں گونج رہی تھیں اور چند ہی لمحوں میں گھوڑے ان کی ہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ہیلن نے سیڑیائی انداز میں سسکی لی اور بولی۔ ”مجھے معلوم ایسا ہی ہو گا۔ ہمیں ہرگز یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ کاش، تم لوگ میرا کہنا مان لیتے تو ہم ہی اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے۔ کاش۔“

چارلس نے احتجاج کیا۔ ”اگر ہم تمہارا کہنا مان لیتے تو ابھی تک انگلینڈ میں ہی تے۔“

ہیلن نے کہا۔ ”تو کیا یہ کوئی بری بات ہوتی۔ اس طرح ہم کم از کم ان دیکھے لرات سے توجہ جکتے تھے۔“

چارلس نے ہیلن سے بحث کرتے ہوئے کہا۔ ”ہیلن! میں تو سمجھا تھا کہ تم زندگی کچھ دیکھنا اور سیکھنا چاہو گی۔ لیکن تم تو گھرے کی مچھلی نکلیں۔“ ان کی نوک جھونک سے الین بیزار ہو چکا تھا۔ ڈیانا میز کے قریب آگئی اور بولی۔

”چارلس! شاید تم یہاں یہ بات نظر انداز کر رہے ہو کہ ہماری آمد یہاں غیر متوقع ہے۔ پہلے وہ گھوڑے بگھی کھینچتے ہوئے ہمیں یہاں لے آئے اور جبکہ ہم یہاں ہیں کھانے کی میز اور یہ سب تکلف۔ آخر ان سب کا مطلب کیا ہے۔ جبکہ یہاں ایک عجیب اپر اسرار ماحول طاری ہے۔“ وہ حیرت سے سب کچھ دیکھ رہی تھی اور ان باتوں کی ناحت اپنے شوہر سے طلب کر رہی تھی، لیکن چارلس اپنی بیوی سے متفق نہیں تھا۔

چارلس کا خیال تھا کہ ابھی گیلری کی میزھیوں سے چار آدمی اتر کر آئیں گے اور کھانے کی میز پر بیٹھ جائیں گے لیکن یہ محض اس کی خوش فہمی تھی اور اس کے اعصاب ب بری طرح تھک گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کیا اس قلعے میں رہنے والے سب لوگ لوگے اور ہرے تھے۔ اس نے سوچا کہ ان باتوں کا جواب جاننے کے لیے کسی نہ کسی کا پر جانا بے حد ضروری تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بے خونی سے آگے بڑھا اور بڑھیاں چڑھنے لگا۔ ہیلن نے چیخ کر کہا۔ ”رک جاؤ۔ نہیں نہیں۔ رک جاؤ چارلس! میں اس محل نما قلعے سے فوراً چلے جانا چاہئے۔ ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔“ وہ بے حد خوف رہ تھی اور اس کا بدن کانپ رہا تھا۔

قریب کھڑی تھی بوکھلا کر پیچھے ہٹی اور اس نے الین کا بازو سختی سے تھام لیا۔ ہیلن نے کہا۔ ”ان حالات میں کم از کم میں تو اندر نہیں جاسکتی۔“

الین نے اسے تسلی دی۔ ”لیکن جان من! اس طرح تم رات بھر سردی میں کس طرح باہر گزارو گی؟ اندر ہم چاروں یکجا ہو کر کسی مشکل کا بہ آسانی مقابلہ کر سکیں گے۔ اکیلے رہ کر تم کسی مصیبت میں مبتلا ہو سکتی ہو۔“ اس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا لیکن ہیلن بری طرح خوفزدہ تھی۔ وہ ان پر اسرار واقعات اور وہاں کے پرہول ماحول سے گھبرائی ہوئی تھی اور ذہنی طور پر شدید عذاب اور الجھن میں مبتلا تھی، آخر چارلس اور ڈیانا کے اصرار پر ہیلن بھی اندر جانے کے لیے رضامند ہو گئی اور وہ چاروں اندر چلے گئے۔ دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

یہ ایک بڑا سا ہال تھا جس کے خاتمے پر ایک خوبصورت گیلری بنی ہوئی تھی۔ فرش سے لے کر گیلری تک بڑی خوبصورت اور رنگین میزھیاں بنی ہوئی تھیں۔ دیواریں اور فرش بڑے قیمتی پتھروں سے بنائے گئے تھے اور ہال کے ایک گوشے سے لے کر دوسرے گوشے تک اعلیٰ قسم کے دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ ایک دیوار میں بہت وسیع اور عریض آتش دان تھا۔ پورا ہال اس وقت گرم تھا کیونکہ آتش دان میں لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑے پڑے تھے اور انگارے دہک رہے تھے۔ آتش دان میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ چارلس کی آواز ہال میں گونجی اور دیواروں سے ٹکرا کر واپس آگئی۔ ”ہیلو۔ کوئی ہے؟“ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ آتش دان کی لکڑیاں ابھی تازہ تھیں۔ یوں جیسے ان کے آنے کے سلسلے میں یہ سب اہتمام کیا گیا تھا۔ چارلس نے دیکھا کہ ہال کے ایک کونے میں ساگوان کی بڑی سی میز پر چار آدمیوں کے لیے نفیس اور عمدہ قسم کے برتنوں میں بہترین کھانا چنا ہوا تھا۔ ابھی وہ حیرت سے بت بنایا یہ سب چیزیں دیکھ رہا تھا کہ باہر گھوڑوں کے ٹاپوں اور گھنٹیوں کی آوازیوں نے ان سب کو چونکا دیا۔

حیرت اور خوف سے ان کے منہ کھل رہ گئے۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکے۔ ایک بڑی سی کھڑکی سے انہوں نے دیکھا کہ بگھی بہت تیزی سے قلعے سے باہر کی طرف جا رہی تھی اور گھوڑے بجلی کی سی تیزی سے بگھی کو کھینچنے لئے جا رہے تھے۔

ایلیں نے اپنا بازو اس کی کمر میں ڈال دیا، لیکن ہیلن نے خود کو چھڑا لیا۔ وہ بہا طرح ہانپ رہی تھی۔ ایلیں نے اسے تسلی دی۔ ”ڈارلنگ! تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔ سہمٹھک ہو جائے گا۔ تھوڑی سی ہمت سے کام لو۔“ چارلس نے بھی ہیلن کو تسلی دی لیکن وہ بدستور ہاتھ پھیلائے التجا کرتی رہی۔ ”خدا کے لیے تم وہاں مت جاؤ۔ میں خدا کا واسا دیتی ہوں تم اوپر مت جاؤ۔“ لیکن چارلس نے اس کی التجا کو نظر انداز کر دیا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا گیلری کی طرف چڑھنے لگا۔ گیلری ختم ہوتے ہی چارلس نے خود کو ایک کاریڈار کے سرے پر پایا۔ یہ ایک طویل سی راہداری تھی اور راہداری کے دونوں طرف زرد مشعلیں جل رہی تھیں اور دور تک بند کمروں کا ایک طویل سلسلہ چلا گیا تھا۔ چارلس نے پوری قوت سے آواز دی۔ ”کوئی ہے؟“ اس کی آواز راہداری میں گونج کر ختم گئی۔

پھر وہ چند لمحوں کے جواب کا منتظر رہا۔ یہ روح فرسا خاموشی اسے بے چین دے رہی تھی۔ اگر اس عمارت میں یہ روشنیاں، مشعلیں وغیرہ نہ ہوتیں تو شاید وہ یہ بھی کر لیتا کہ صدیوں سے کسی انسان نے اس قلعے میں قدم بھی نہ رکھا ہوگا۔ بغیر کسی ملے وہ نیچے جانے کے لیے تیار بھی نہیں تھا۔ وہ دبے پاؤں پہلے کمرے کے دروازے گیا۔ آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ اس نے آہستہ سے بیٹھ گیا۔ دروازہ کھل گیا اور چارلس اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں ملگجی سی روشنی تھی اور اس روشنی میں آگ کے شعلوں کی سرخی شامل تھی جو آتش دان میں جل رہی تھی۔ کمرہ خوب گرم تھا اور کمرے کے ایک کونے میں اوپر تلے چند سوٹ کیس رکھے تھے۔ باہر جاتے جاتے چارلس کے قدم جیسے کسی جکڑ لئے ہوں۔ اس نے ان سوٹ کیسوں پر لکھے ہوئے۔ ”اے۔ کے“ کے الفاظ پڑھ لئے۔ جو کہ واضح نظر آرہے تھے۔ یہ ایلیں کینٹ کا سوٹ کیس تھا اور اسے اچھی طرح تھا کہ اس نے اسے خود کوچ پر لا دیا تھا۔

وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلا اور گیلری میں کھڑا ہو کر نیچے دیکھنے لگا۔ ہیلن ایک ہاتھ منہ پر رکھا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ابھی وہ خوف سے چیخنے لگے گی۔ وہ

ایلیں نے اس کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ چارلس نے کہا۔ ”ایلیں! تم ذرا ایک لمحوں کے لیے اوپر آؤ۔“ ہیلن نے آگے بڑھ کر اپنے شوہر کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے پر چڑھ چکا تھا اور گیلری کے قریب آ گیا تھا۔ چارلس اسے کمرے میں لے گیا اور وہ سب چیزیں دکھائیں۔ ایلیں کو کسی صورت ان باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ انہیں نظر کا قریب سمجھ رہا تھا لیکن جب اس نے اپنا سوٹ کیس اور اپنی قمیض دیکھی جو بیڈ کے سرہانے تہ کی ہوئی رکھی تھی تو اس کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئیں۔

چارلس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہاں بھی آتش دان میں آگ روشن تھی اور صورت حال پہلے کمرے سے بالکل مختلف نہیں تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ کمرہ چارلس کے لیے مخصوص تھا اور اس کا سامان بھی یہاں بڑے قریب سے رکھا ہوا تھا۔

وہ ان بھول بھلیوں میں گم تھے کہ یکایک ہال میں ایک وحشت ناک چیخ ابھری جو بڑی تک گونجتی رہی۔ یہ روح فرسا چیخ ہیلن کی تھی۔ ایلیں اور چارلس بے قرار ہو کر باہر طرف دوڑے۔ ڈیانا اور ہیلن ہال کے وسط میں کھڑی خوف سے لرز رہی تھیں اور ان کے چہرے ڈھلے ٹھٹھے کی طرح سفید تھے۔ وہ ہال کی دیوار کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔

چارلس اور ایلیں نے دیکھا کہ ہال کی دیوار کے قریب ایک بلند قامت، بے حد مورت اور خوفناک آنکھوں والا اجنبی شخص چپ کھڑا تھا۔ اس نے بوسیدہ سیاہ ماتمی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی بھنویں گھنی اور سیاہ تھیں اور دانت زرد تھے۔ اس کے چہرے خون آشام وحشت برس رہی تھی۔ ایلیں غرایا۔ ”یہ کیا بد تمیز ہے؟ یہ کیا طریقہ ہے؟“

باتم اس سے زیادہ بہتر انداز میں ہمارا خیر مقدم نہیں کر سکتے تھے؟“ اس کی آواز غصے کی آواز سے کانپ رہی تھی۔ خود چارلس کی حالت بھی غصے سے غیر ہو رہی تھی۔ اجنبی نے بے مذہب اور شائستہ انداز میں تعظیماً جھکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میرے



کہ اجنبی جو شاید یہاں کا ملازم تھا اعلیٰ قسم کا سوپ لے کر نمودار ہوا اور سرو کرنے لگا۔ کھانا بے حد لذیذ اور اشتہا انگیز تھا۔ اعلیٰ قسم کا روسٹ مرغ، بہترین سلاد، اعلیٰ قسم کی چٹنیاں اور خوش ذائقہ چٹ پٹی مصالحہ دار فنگر فش کے علاوہ آلو کے بہترین فرائی کئے ہوئے فرنج فراز اور کئی دوسری چیزوں پر مشتمل تھا جو بڑی نفاست سے پکایا گیا تھا۔ چارلس نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

اس نے جھک کر کہا۔ ”جناب! خادم کو کلو کہتے ہیں۔“  
چارلس نے پوچھا۔ ”بہت خوب تو کلو کیا تمہارے آقا ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوں گے۔“

کلو نے معذرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے افسوس ہے وہ ایسا نہیں کر سکتے۔“

ایلن نے پوچھا۔ ”کیا وہ بیمار ہیں؟ اور چلنے پھرنے سے معذور ہیں؟“  
وہ چاروں منتظر تھے کہ کلو ان کے سوالات کے جواب میں آخر کیا کہے گا۔ کلو نے سپاٹ چہرہ سے ان کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”جی نہیں۔ وہ مر چکے ہیں۔“ کلو نے سرد مہری سے جواب دیا۔ اس کا لہجہ موت کی طرح سرد تھا۔

ہیلن کے ہاتھ سے پلیٹ نیچے فرش پر جاگری اور اس کا منہ فرط حیرت اور خوف سے پھٹا رہ گیا۔ ہال میں گرمی کے باوجود چارلس کو جھرجھری سی آگئی۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے ہال کے سارے دروازے کھول دیئے ہوں اور بخ بستہ سردی کی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی جا رہی ہو۔ اس نے بڑے اعتماد اور وقار سے کلو کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کبھی، کبھی اور ڈر وغیرہ ان سب چیزوں کا کیا مطلب ہے اور آخر اس میں کیا راز ہے؟“

کلو نے چارلس کی جانب بے یقینی سے دیکھا اور بولا۔ ”اب اس میں بھلا راز کی کیا بات ہو سکتی ہے۔ یہ باتیں تو روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ یقیناً جناب! میرے آقا اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن انہوں نے جو ہدایات مجھے دی تھیں اور جن پر عمل کرنا میرا فرض ہے۔ کیا میں ان سے پہلو تہی کر سکتا ہوں۔ ان کے حکم کے مطابق اس محل کے

پھر چارلس نے کہا۔ ”لیکن آخر یہ سب کیا مذاق ہے؟ تم نے آخر اتنی دیر کیوں اور کہاں لگائی؟ ہم لوگ تو جانے کب سے پاگلوں کی طرح آوازیں دے رہے تھے اور نہ جانے کہاں غائب تھے۔“

اجنبی نے جھک کر کہا۔ ”میں دراصل آپ لوگوں کا سامان درست کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کمرے آپ کو پسند آئے ہوں گے۔“

چارلس نے کہا۔ ”ہر چیز واقعی قابل تعریف ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا۔“ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اجنبی کراہت سے مسکرا دیا۔

”میرے آقا کی مسمان نوازی تو دور دور تک مشہور ہے۔“  
چارلس نے کہا۔ ”لیکن ہم لوگ تو تمہارے آقا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔“

اجنبی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر آپ لوگ تیار ہوں میں کھانا پیش کروں؟“

چارلس کے ذہن میں اس وقت سینکڑوں سوالات گلبلا رہے تھے لیکن وہ جانتا کہ یہ ذلیل آدمی اس کے سوالوں کا جواب نہیں دے رہا۔ ویسے بھی اب اسے بھوکا بری طرح ستا رہی تھی۔ لہذا ان باتوں کو پھر کسی وقت پر بھی اٹھایا جاسکتا تھا۔ اس اجنبی کی تائید میں سر ہلا دیا اور اجنبی ایک کمرے کا دروازہ کھول کر غائب ہو گیا۔ ہیلن اطمینان کا سانس لیا اور بولی۔ ”خدا کا شکر ہے۔ میں اب بھی یہی کہتی ہوں کہ ہمیں یہاں سے چل دینا چاہئے۔“

ڈیانا نے چارلس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”خود میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں کہ آخر یہ کیا گورکھ دھندہ ہے لیکن اس وقت بھوک اتنی زوروں کی لگی ہوئی ہے کہ میں سوچ رہا نہں۔“ ڈیانا سوچ رہی تھی کہ اب سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے وہ ایک جنگل میں اکیلے بھوکے پیاسے کھڑے تھے اور اب گرم بستر، عمدہ کھانا اور ایک مسمان میزبان ان سب کے انتظار میں تھے۔ اسے یہ سب کسی نعمت سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ چارلس نے ان سب سے کھانے کی میز پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ ابھی وہ بیٹھے ہی

عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔“ ایلن نے ہیلن کا بازو تھما اور اسے پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔ ”ڈارلنگ! پہلے پہل تو واقعی مجھے بھی یہ سب بڑا عجیب اور پراسرار سا لگا لیکن اب تو ہر بات عیاں ہو چکی ہے۔ اب بھلا کس بات کا خوف ہے۔“

ہیلن نے آہستہ سے اپنا بازو چھڑایا اور اپنے شوہر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”حیرت ہے تم اتنی جلدی آخر کس طرح فادر شینڈور کی نصیحت بھول گئے ہو۔ تمہیں یاد نہیں۔ انہوں نے کس قدر سختی سے ہمیں اس منحوس قلعے سے دور رہنے کے لیے کہا تھا۔“ ایلن نے بے نیازی سے کندھے اچکائے چارلس نے میز کے ایک کونے پر رکھی ہوئی الماری سے بہترین کوالٹی کی شراب کی بوتل اور بلوری جام نکال لئے تھے اور انہیں شراب سے بھرنے لگا۔ پھر اس نے شراب کا ایک گلاس اٹھایا اور بولا۔ ”میں جانتا ہوں فادر شینڈور یہ سب صرف اس لیے کہہ رہے تھے کہ ہم ان کے ہمراہ کلین برگ جائیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمیں یہاں آنے کا موقع مل گیا۔ اب ہمیں آنجہانی کاؤنٹ کی عنایات کا شکر گزار ہونا چاہئے اور لطف اٹھانا چاہئے۔ میں شراب کا پہلا جام کاؤنٹ کے نام تجویز کرتا ہوں۔ خدا اسے کروٹ کروٹ سکون نصیب کرے۔“

ابھی چارلس نے یہ الفاظ ادا ہی کئے تھے کہ آتش دان میں لکڑیاں زور سے چنچیں، آگ زور سے بھڑکی اور شعلوں کی سرخ زبانیں آتش دان سے باہر لپکنے لگیں۔ پھر اسی لمحے باہر بادلوں کی گرج اور بجلی کی خوفناک چمک اور گڑگڑاہٹ نے پوری عمارت کو لرزا کر رکھ دیا اور یوں محسوس ہوا جیسے بہت سی خبیث روحوں اپنی مکروہ آوازوں میں مین کر رہی ہوں۔ باہر ہوا کا خوفناک شور ایک طوفان کی شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ڈیانا اور ایلن نے بھی اپنے جام ٹکرائے۔ پھر ڈیانا کی دلکش آواز ہال کی وسعتوں میں گونج کر گم ہو گئی۔ کاؤنٹ ڈریکولا۔“ اس نے کہا۔ اسی لمحے بغیر کسی آہٹ کے کلو اندر آگیا اور میز پر اسے ہوئے برتن اور سوپ کے خالی پیالے اکٹھے کرنے لگا۔ باہر بجلی زور سے کڑکی اور ہرا ہال بجلی کی تیز آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی میں نما گیا۔ ڈیانا نے مڑ کر چارلس کی طرف دیکھا جو اب جام اٹھائے ایلن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایلن نے نرمی سے اپنا گلاس

میرا مطلب ہے اس قلعے کے دروازے اجنبیوں اور اس علاقے میں آنے والے مہمانوں کے لیے ہمیشہ اسی طرح کھلے رہیں گے۔ یہ ان کی آخری وصیت اور خواہش تھی اور میں صرف ان کی خواہشات کا احترام کرنے کے لیے زندہ ہوں۔“ اس کی آواز رندھ سی گئی۔ چارلس نے پوچھا۔ ”تمہارے آقا کا کیا نام تھا؟“ کلو نے بڑے پراسرار انداز میں آتش دان کی طرف دیکھا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو اور پھر کہا۔ ”ان کا نام ہر کوئی جانتا ہے۔ لوگ انہیں کاؤنٹ ڈریکولا کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ ایک بہت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، مجھے فخر ہے کہ مجھے ان کی خدمت کرنے کا موقع ملا۔“

چارلس نے کہا۔ ”کیا اب ان کے بعد اور کوئی اس قلعے میں نہیں رہتا؟“ کلو نے جواب دیا۔ ”جی نہیں، میرے آقا کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔“ یوں لگتا تھا جیسے وہ مزید سوالات کی الجھن سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی خوف اور حیرت کے طے جلے تاثرات لئے وہ چاروں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے پھر انہوں نے سوپ پینا شروع کر دیا۔ سوپ اس قدر خوش ذائقہ تھا کہ اس کی لذت نے خوف اور وہم کو ان کے ذہن سے وقتی طور پر دور کر دیا۔

چارلس نے سوپ پی کر نیپکن سے ہاتھ پونچھے اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کل ہمیں بل پیش کیا جائے گا۔“ ڈیانا نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ چارلس اپنی طبعی خوش مزاجی کی وجہ سے ایسا کر رہا تھا کیونکہ اسے ان سنگین حالات میں بھی مذاق سوجھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کم از کم انگلینڈ میں تو ایسے شاہ خراج اور فراخ دل لوگ کم ہی ملتے ہیں جو مرنے سے پہلے یہ وصیت کر جائیں کہ ان کے بعد ان کے محلات کے دروازے ہمیشہ اجنبیوں کے لئے کھلے رکھے جائیں۔

پھر وہ سب کھانے کی نفاست کے متعلق باتیں کرنے لگے اور اس اجنبی جگہ پر کلو اور اس کے آنجہانی آقا کے حسن سلوک اور مہمان نوازی کی تعریف میں مگن ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ہیلن اور کوچبان خواہ مخواہ اتنی اچھی جگہ سے خوفزدہ تھے حالانکہ خائف ہونے کی بظاہر تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ ہیلن نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے کہا۔ ”ڈرتی تو میں نہیں ہوں۔ ہاں یہ جگہ کچھ ایسی بھیانک اور دہشت انگیز ہے کہ مجھے کچھ

کیونکہ اسے یقین تھا کہ احق ایلن اس کا تعاقب کر رہا ہوگا۔

وہ تابوت اٹھائے نیچے تہہ خانے میں چلا گیا۔ اس کے آقا کی خواہش یہی تھی کہ قربانی کی رسم یہاں انجام دی جائے۔ کلو نے تابوت ایک طرف رکھ دیا اور خود تاریکی میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور ایلن موم بتی سنبھالے اندر آیا۔ اس کے چہرے پر فکر اور تجسس کے آثار نمایاں تھے۔ وہ دبے پاؤں تابوت کے قریب گیا اور موم بتی کی بھڑکتی ہوئی لومیں اس پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنے لگا۔ تابوت پر کوئی تاریخ یا فقرہ درج نہیں تھا۔ صرف ”کاؤنٹ ڈریکولا“ کھدا ہوا تھا۔

کلو نے چشم زدن میں بھانپ لیا کہ اب موقع آ گیا ہے کہ وہ اس سنہری لمحے کا بہترین مصرف کر سکے۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکالا اور اس سے پہلے کہ ایلن چیخ سکے یا کوئی آواز نکال سکے۔ ایک ہی وار میں خنجر اس کے سینے میں اتار دیا۔ ایلن بے جان ہو کر فرش پر گرے لگا تو کلو نے اسے سنبھالا اور تابوت کا ڈھکنا کھول کر اسے تابوت کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا۔

پھر اس نے تیزی سے کونے میں رکھا ہوا مرتبان اٹھایا اور ڈریکولا کی راکھ اس تابوت میں ڈال دی۔ تابوت کے عین اوپر ایک رسی کنڈے سے بندھی ہوئی لٹک رہی تھی۔ کلو نے ایلن کی لاش کو کھینچ کر اس کے دونوں پاؤں رسی میں باندھے اور لاش کو الٹا کر کے تابوت کے اوپر لٹکا دیا۔ پھر اس نے اپنے تیز دھار خنجر سے ایلن کی شہ رگ کاٹ ڈالی۔ لاش تڑپنے لگی اور خون کا فوارہ راکھ پر گرنے لگا۔

خون بڑی تیزی سے راکھ پر گر رہا تھا۔ کلو نے خنجر کا ایک اور وار کیا اور گرم گرم تازہ گاڑھا خون مزید تیزی سے گرنے لگا۔ ایک جھٹکے سے کلو نے لاش کی گردن کاٹ ڈالی اور سر کو دھڑ سے علیحدہ کر کے اسے ایک طرف اچھال دیا۔ اب وہ دو زانو ہو کر تابوت کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں خوف اور احترام کی وجہ سے جھکی ہوئی تھیں۔

باہر بجلی بہت زور سے چمکی اور پھر بادل گرجنے لگے۔ روشنی کا ایک تیز جھپکا سا ہوا اور پھر تابوت کے ایک سرے پر ایک غیر انسانی ہاتھ نمودار ہوا۔ ہاتھ پر خون کی رگیں ابھری ہوئی تھیں اور یہ شیطانی ہاتھ ڈریکولا کا تھا۔ کلو گھٹنوں کے بل کھڑا تھا۔ تہہ خانے

اٹھایا اور کہا۔ ”کاؤنٹ ڈریکولا۔“ لیکن کلو نے محسوس کیا کہ ہیلن کا جام ابھی تک شراب سے لبریز تھا اور اس نے دوسروں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

○☆☆○

کاؤنٹ ڈریکولا کو گزرے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے ظالم اور خونخوار درندہ تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کی دہشت اور خونریزی سے خائف رہتے تھے اور ہمیشہ اس ناک میں رہا کرتے تھے کہ جب بھی موقع ملے اسے کیفر کردار تک پہنچا دیں۔ اس کے متعلق بڑی بھیانک اور پراسرار کہانیاں مشہور تھیں اور اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایک دن موقع پا کر کچھ لوگوں نے اسے دبوچ لیا اور ختم کر دیا تھا۔

ڈریکولا ایک بدروح تھی۔ اس کی بچی ہوئی راکھ کو کلو نے مدتوں سے سنبھال رکھا ہوا تھا۔ شیطانی قوتوں نے اب اسے یہ زریں موقع فراہم کر دیا تھا اور ڈریکولا کی خور آشامی اور اس کی پیاس کو بجھانے کا سامان ہو گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ چار افراد خوف اور دہشت کے اس جال میں آکر پھنس گئے تھے بلکہ یہ کہ وہ چاروں مطمئن تھے جیسے وہ کمر بہت اچھی جگہ آگئے ہوں۔

کلو اپنے آقا کو دوبارہ زندگی دینے کے لیے بے قرار تھا۔ اس وقت وہ راہداروں میں بے چینی سے ٹھل رہا تھا۔ رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ طرح طرح کے منصوبے بنا رہا تھا۔ مدتیں گزر گئی تھیں کہ ان ایوانوں میں خون اور قتل و غارت کے ہوشیامناظر دیکھنے کو نہیں ملے تھے۔ صرف اس لیے کہ اس کا آقا ڈریکولا راکھ کی صورت میں چنگاری بننے کا طویل عرصے سے منتظر تھا۔

کلو نے آہستہ سے ہیلن کے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور آواز دی ہیلن بے چینی سے اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس نے اپنے شوہر ایلن کو جگایا ہیلن کی بے چینی کو دیکھتے ہوئے ایلن نے موم بتی اٹھائی اور دبے پاؤں کمرے سے باہر آیا۔ کلو اسی موقع کا منتظر تھا۔ اس نے کونے میں کھڑا ہوا تابوت اٹھایا اور اسے اپنی کمر لاد کر گیلری کا زینہ اترنے لگا۔ وہ تابوت لے کر دانستہ طور پر آہستہ آہستہ گھسیٹ رہا

میں ڈریکولا کی خوفناک آواز گونجی اور اپنے آقا کی آواز سن کر کلو کو کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ ایک طویل عرصے کے انتظار کے بعد اپنے آقا کی آواز سن رہا تھا۔

وہ بدستور سر جھکائے آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا تہہ خانے سے باہر نکل کر گیلری کی طرف چل پڑا۔ انہی سیڑھیوں پر کچھ دیر پہلے ایلن چل کر تہہ خانے تک آیا تھا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

کلو کے دونوں ہاتھ خون آلود تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ پیچھے چھپا لئے۔ پھر آہستہ سے ہیلن کے کمرے کے سامنے جا کر سرگوشی کی۔ ”ہیلن!“ ہیلن نے سمجھا کہ شاید ایلن واپس آ گیا ہے، اس نے بے دھڑک دروازہ کھولا اور کلو کو اپنے سامنے پا کر ٹھٹھک گئی۔ ”مادام مجھے افسوس ہے لیکن ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ آپ کے شوہر کی حالت خراب ہے۔ جلدی سے میرے ہمراہ چلئے۔“ کلو جیسے کہیں دور سے بولا۔

ہیلن فوراً اس کے پیچھے چل پڑی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن کلو سنی ان سنی کر کے آگے چلتا رہا۔ وہ تیزی سے تہہ خانے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں کاؤنٹ ڈریکولا اپنے شکار کا منتظر تھا۔ اس نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا اور ہاتھ سے ہیلن کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

ہیلن نے دیکھا کہ اس کے شوہر ایلن کی بغیر سر کے لاش رسی سے بندھی ہوئی الٹی لٹکی ہوئی ہے۔ ہیلن نے زور زور سے آنکھیں ملیں جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہو اور پھر اچانک زور سے چیخ پڑی۔ دور تک اس کی چیخ گونج کر رہ گئی۔ وہ ہذیبی انداز میں بڑبڑا رہی تھی۔ اسے کچھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ دیوانہ دار دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے پر لگ جائیں اور وہ اس جگہ سے فرار ہو جائے لیکن اسے راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

زینے پر سیاہ دھاریوں والا سرخ چنچہ اوڑھے ڈریکولا اس کا منتظر تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ہیلن کا بازو جکڑ لیا۔ کلو نے دیکھا اس کے آقا کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور اس کے تیز نوکیلے دانت جبڑوں میں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ وہ اپنی تمام خباثتوں کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ ہیلن نیم غنودگی اور بے ہوشی کے عالم میں اس کے بازوؤں میں کسمارہی تھی۔

ڈریکولا نے اسے اپنا شکار بنا لیا تھا۔ پھر ڈریکولا کے تیز خون آشام دانت ہیلن کی خوبصورت گردن میں اترتے چلے گئے اور وہ تڑپتی رہی۔

○☆☆○

صبح ہو چکی تھی۔ چارلس ابھی تک سویا ہوا تھا کہ کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر زور سے ہلاتا شروع کر دیا۔ یہ ڈیانا تھی اور نہادھو کر بے حد تروتازہ اور شاداب نظر آ رہی تھی۔ چارلس کو اکثر ڈیانا سے یہی شکایت رہتی تھی کہ بہت صبح سویرے اٹھ جایا کرتی ہے اور پھر اسے بھی جگا دیا کرتی ہے۔ وہ اس وقت بھی بہت چاق و چوبند نظر آ رہی تھی۔

”ہوں۔ کیا بات ہے؟“ چارلس نے ناگواری سے کہا۔

”اٹھئے بھی۔ دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔ میں آپ کو جگا جگا کر تھک چکی ہوں۔ ایلن اور ہیلن دونوں غائب ہیں۔ وہ شاید جا چکے ہیں۔“ ڈیانا کی آواز میں تفکر جھلک رہا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا، کہاں جا چکے ہیں؟“ چارلس نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

ڈیانا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”وہ چلے گئے ہیں۔ سامان بھی جا چکا ہے۔ سب کچھ چلا گیا ہے۔“ وہ زور زور سے زور رہی تھی۔ چارلس نے صورت حال کی نزاکت کو فوراً بھانپ لیا۔ اس نے چادر ایک طرف پھینکی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ لوگ واقعی اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ کمرے میں بستر بڑے سلیتے سے بچھا ہوا تھا۔ آتشدان میں راکھ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے ایلن اور ہیلن کبھی اس بیڈ پر لیٹے ہی نہ ہوں۔ ہر چیز بڑی عجیب اور پراسرار سی نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں حیران تھے کہ آخر کلو کہاں جا کر دفن ہو گیا۔ چارلس فوراً کمرے سے باہر نکلا اور گیلری کی سیڑھیاں اتر کر ہال کے وسط میں کھڑا ہو کر کلو کو آوازیں دینے لگا۔ اس کی آواز ہال میں گونج رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو خون اس کی رگوں میں بھنے لگا۔ ڈیانا غائب تھی۔ ”اف خدا یا!“ اس نے سوچا۔ ”کیا لوگ یہاں ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں؟“ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا واپس کمرے میں آیا۔ ڈیانا جلدی جلدی سوٹ

ذاکت کو سمجھ نہیں رہی ہو۔ تم نے دیکھا لوگ قلعے کے تذکرے سے ہی خائف ہیں۔ کوئی اس بات کا ذکر سنتا بھی گوارا نہیں کرتا۔ ہماری مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔“ پھر اس نے ڈیانا کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”جان من۔ تم یہاں نام چھ بجے تک میری منتظر رہنا۔ میں ہر قیمت پر چھ بجے تک لوٹ آؤں گا۔ مجھے یہ پراسرار معمہ ضرور حل کرنا ہے۔ آخر ہیلن اور ایلن کہاں جا سکتے ہیں؟“

ڈیانا بری طرح لرز رہی تھی۔ وہ بے حد خائف تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے اور چارلس اسے الوداعی سلام کر کے قلعے کی جانب چل پڑا۔ چارلس قلعے کے صدر دروازے سے ہو کر عمارت کے اندر گم ہو گیا اور ڈیانا جھونپڑی میں آگئی۔

چارلس نے ایک بار پھر کمروں کا جائزہ لیا۔ لیکن اسے ایلن اور اس کی بیوی ہیلن کی گمشدگی کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ اس نے کچن اور صحن کے علاوہ دوسرے کمروں میں اچھی طرح جھانکا لیکن کسی آدم نہ آدم زاد کا کوئی نشان نہیں تھا۔ خالی کمرے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

ایکایک ہال میں اس کا ہاتھ ایک دیوار سے لٹکے ہوئے پردے پر پڑا۔ ارے! یہ ایک تہ خانہ تھا۔ اندر ہلکی ہلکی روشنی تھی جو آگے جا کر تاریکی میں بدل گئی تھی۔ یقیناً ایلن اور ہیلن اسی تہ خانے میں ہوں گے! اس نے سوچا اور پھر دل کڑا کر کے آہستہ آہستہ تہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی اس نے خود کو ایک نیم روشن کمرے میں پایا۔ اوپر کی طرف ایک مچان پر بڑا سا تابوت رکھا تھا۔ وہ تابوت کے قریب گیا۔ اس پر ”کاؤنٹ ڈریکولا“ کے الفاظ کندہ تھے۔

وہ اس ماحول میں خود کو خوف زدہ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن تحیر اور تجسس نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ اسی تابوت کے قریب ایک بڑا سا صندوق موجود تھا جس کا ڈھکنا کھلا تھا۔ اس نے جھانک کر اس صندوق میں دیکھا اور پھر تورا کر پیچھے ہٹا۔ ایلن کا بے جان اور سرد چہرہ اسے گھور رہا تھا۔ گردن بے حد غیر قدرتی انداز میں مڑی ہوئی تھی۔ چارلس نے محسوس کیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ ذرا غور کیا تو معلوم ہوا کہ گردن اور دھڑ علیحدہ تھے۔ خون

کیس میں اپنے کپڑے ٹھونس رہی تھی۔ ”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“

”میں فوراً یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔“ ڈیانا نے سپاٹ لمبے میں کہا۔ ”لیکن ایلن اور ہیلن کے بغیر ہی.....؟“

”چارلس نے پوچھا۔

”تو اور کیا۔ وہ بھی تو ہم دونوں کو یہاں چھوڑ کر خود چل دیئے ہیں۔“ ڈیانا نے بے نیازی سے کہا۔

اب کسی قسم کی بحث کرنی بے کار تھی۔ چارلس نے اس کا ہاتھ ہٹا کر دیا۔ ڈیانا زور زور سے سسکیاں لے رہی تھی اور اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور وہ بے حد پریشان نظر آ رہی تھی۔ سوٹ کیس وزنی تھے پھر بھی دونوں میاں بیوی نے دو دو سوٹ کیس اٹھا لیے اور ڈنگ گاتے ہوئے پگنڈی پر چل پڑے۔ وہ جلد از جلد اس بھیانک قلعے سے دور چلے جانا چاہتے تھے۔ وہ بے حد آہستہ آہستہ پہاڑی کی ڈھلان سے اتر رہے تھے۔ ڈیانا کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی انجانی ان دیکھی قوت بار بار انہیں واپس قلعے کی طرف بلا رہی تھی۔

بالآخر وہ چوراسے پر پہنچے۔ دن کے وقت قلعہ اجنبیوں کے لیے خاصا پرکشش لگ رہا تھا۔ چارلس سوچ رہا تھا اگر اس کے بھائی ایلن اور اس کی بیوی ہیلن کو کچھ ہو گیا تو وہ خود کو کبھی معاف نہ کر سکے گا۔ ڈیانا نے اس کے چہرے سے اس کے دل کی بات جان لی اور شدت سے اس بات کی مخالفت کرنے لگی کہ چارلس واپس چلے۔

اس نے کہا۔ ”تمہیں میرا کوئی خیال نہیں۔ میری خاطر ہی سہی۔ تم واپس نہیں جا سکتے۔“ ڈیانا کا دل بھر آیا اور وہ سسکنے لگی۔

”اور ہیلن اور ایلن کا کیا بنے گا۔ ڈیانا، ذرا سوچو تو سہی میں ان دونوں کو وہاں اکیلا کیسے چھوڑ دوں۔ خدا جانے ان کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے ہوں۔ نہیں نہیں، مجھے جانا ہی ہو گا۔“ چارلس نے قطعی فیصلہ دے دیا۔

”میرا خیال ہے ہمیں جوزف سیاد جا کر لوگوں کو مدد کے لیے بلا لینا چاہئے۔“ ڈیانا نے تجویز پیش کی۔

لیکن چارلس کو اس کی تجویز سے اتفاق نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ”تم معاملے کو

رہی تھی۔ اس کا دل خوف کی وجہ سے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دور سے اسے گھوڑے کے ٹاپوں اور گھنٹیوں کی آواز قریب آتی سنائی دی اور اس کے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔

گھوڑے بالکل پرانے انداز میں بگھی کھینچتے ہوئے جھوپڑی کے قریب آ کر رک گئے۔ ڈیانہ کی جان ہی تو نکل گئی۔ پھر جیسے کسی نے اسے سوتے سے چونکا کر جگا دیا ہو۔ جھوپڑی کا دروازہ کھلا اور کلوڈ اندر آیا۔ ڈیانہ کی چیخ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ ”مجھے افسوس ہے مادام کہ میں نے آپ کو پریشان کیا۔ آپ کے خاوند قلعے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں!“ اس نے ہاتھ سے ڈیانہ کو باہر چلنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر بگھی کا دروازہ کھول دیا۔ ڈیانہ نے غصے سے کلوڈ کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”میں پوچھتی ہوں وہ سب کہاں ہیں۔ ایلن، چارلس، ہیلن۔ آخر یہ سب کیا بکواس ہے؟“

کلوڈ نے احتراماً جھک کر کہا۔ ”آپ کے خاوند آپ کو تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیں گے۔ آپ تشریف لے چلے۔“

ڈیانہ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ایک بار پھر قلعے میں جائے۔ عین لیکن ہے چارلس سے اسے کچھ معلوم ہو سکے۔ وہ آگے بڑھی اور بگھی میں سوار ہو گئی۔ گھوڑے برق رفتاری سے کوچ کو لئے ہوئے قلعے کی طرف بڑھنے لگے۔ جونہی بگھی قلعے کے اندر پہنچی، کلوڈ نے تیزی سے اتر کے بڑے ادب سے ڈیانہ کے لیے دروازہ کھولا اور اٹھ سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ڈیانہ کو یوں لگا جیسے کلوڈ اس کا مذاق اڑانے کی حد تک دوب ہوا جا رہا تھا۔

ڈیانہ ہال میں داخل ہوئی اور ہیلن کی بدلی ہوئی اجنبی سی آواز نے اس کا استقبال کیا۔ ”ہم لوگ تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ تم کب تک لوٹو گی؟“ ایلن کی آواز بے حد مختلف اور عجیب سی تھی۔ ڈیانہ کو یوں لگا جیسے اس کے سارے جسم ل چوئیٹیاں سی ریگنے لگی ہوں۔

ہیلن سیڑھیوں کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ اس نے ب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی سی تھیں جیسے ابھی ابھی وہ

کے دھبے ایلن کے جسم اور کپڑوں پر جھے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ایلن نے بے حد اذیت میں تڑپ تڑپ کر جان دی ہو۔

چارلس بڑے دل گردے والا آدمی تھا۔ لیکن یہ صورت حال دیکھ کر خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سردی کی ایک لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی ٹانگیں جواب دے گئی ہوں اور وہ زمین پر گرتے گرتے بچا لکین اس نے بمشکل تمام اپنے حواس جمع کیا اور دوسرے تابوت کا ڈھکنا اٹھانے کی کوشش کی۔ تابوت کا ڈھکنا بہت وزنی تھا، جونہی اس نے ایسا کیا وہ پھسل کر دوسری جانب جا گرا اور ڈھکنا گرنے کی گونج نہ خانے کے پرہول سنائے کو چرتی ہوئی گزر گئی۔ چارلس کو یوں لگا جیسے اس کے دل و دماغ میں ایک سنسنی سی پھیل گئی ہو اور اس کے سر میں ہتھوڑے سے بجنے لگے اور وہ خوف سے بری طرح کانپنے لگا۔

تابوت کے اندر سیاہ کفن میں ملبوس ایک بلند قامت لاش رکھی تھی۔ اس کے دونوں استخوانی ہاتھ اس کے سینے پر دھرے ہوئے تھے۔ چارلس نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ یہ کوئی خبیث بدروح تھی۔ لاش کے چہرے پر بے حد مکروہ اور غلیظ مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور دونوں بھنے ہوئے جڑوں کے گوشوں میں نوکیلے تیز دانت باہر کی طرف نکلے نظر آرہے تھے۔ چارلس کو غش آگیا۔ کیونکہ جونہی اس کی انگلیاں تابوت کے کونے سے نکرائیں، تابوت میں لیٹے ہوئے عفریت نے فوراً آنکھیں کھول دیں تھیں اور آہستہ آہستہ اٹھنے لگا۔

چارلس کو اپنی چیخ کی آواز دور کسی کنویں سے آتی ہوئی سنائی دی۔ وہ فرش پر اوندھے منہ جا گرا۔ پھر گھٹنٹا ہوا سیزمیوں تک پہنچا اور بغیر مڑ کے دیکھے ہوئے تیزی سے گر تا پڑتا تمہ خانے سے باہر کی طرف دوڑا۔ وہ جلد سے جلد تمہ خانے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا اب اس کی جان پر بن گئی ہے۔

○✽○

ڈیانہ کافی دیر سے جھوپڑی میں آگ روشن کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میلی لکڑیوں کی وجہ سے اندر دھواں بھر گیا تھا اور اب رات کی تاریکی بھی آہستہ آہستہ بڑھ



اس بھیانک خواب سے بچنے کے لیے خود کو چارلس کی آغوش میں سمودنا چاہتی تھی۔ چارلس نے ڈیانا کو اپنے پیچھے چھپا لیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آنکھیں ڈریکولا پر سے نہیں ہٹائیں پھر وہ چیخا۔ ”ڈیانا۔ جاؤ۔ بگھی لے کر یہاں سے جلد از جلد نکل جاؤ۔“

”میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔“ ڈیانا نے کہا۔  
”جو میں کہتا ہوں وہی کرو۔“ چارلس پھر چلایا۔

ڈریکولا حالات سے بے نیاز ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے کوئی بلی دو چوہوں کو دبوچنے کے لیے آگے بڑھ رہی ہو۔ جیسے اسے یقین ہو کہ دونوں میں سے ایک چوہے کو شکار تو وہ کر ہی لے گی۔ ڈیانا اس عالم میں چارلس کو تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی لیکن چارلس نے اسے باہر کی طرف دھکیلا تو وہ وہاں سے باہر کی جانب لپکی۔ ہیلن اب پھر ہنسی اور آگے جھپٹ کر ڈیانا کا بازو تھام لیا۔ دونوں عورتیں گھٹم گھٹا ہو کر فرش پر گر گئیں۔

ڈریکولا چارلس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ چارلس نے ایک دوہتر ڈریکولا کے سینے پر مارا لیکن وہ صاف وار بچا گیا۔ پھر جھک کر کسی بچے کی طرح چارلس کو اٹھالیا اور ہال کی دیوار سے دے مارا۔ چارلس کو خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ وہ ایک زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گرا، پھر بمشکل تمام اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈریکولا ہنسا اور پھر اپنے شکم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چارلس بے بسی سے دیوار کے سارے کھڑا ہو گیا اور لڑکھڑاتے ہوئے ادھر ادھر کسی ہتھیار کی تلاش میں دیکھنے لگا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک زنگ آلود تلوار پڑی ہوئی تھی۔ اس نے پوری طاقت جمع کر کے وہ تلوار اٹھائی اور اپنی طرف بڑھتے ہوئے ڈریکولا پر ایک زور کا وار کیا۔ ڈیانا بدستور ہیلن سے لڑ رہی تھی لیکن دونوں عورتوں کی نگاہیں ڈریکولا اور چارلس پر جمی ہوئی تھیں۔

ڈریکولا نے تلوار کا وار بچایا اور تلوار کا پھل اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ سے خون ٹپک رہا تھا۔ پھر اس نے ایک ہی جھٹکے سے تلوار کھینچ لی اور طنزیہ انداز میں مکرراتے ہوئے اسے دو ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔ پھر آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ

نہند سے جاگی ہو۔ ڈیانا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہیلن کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے چارلس کے بارے میں پوچھا اور ہال کے وسط میں جا کر رک گئی۔ پھر بولی۔ ”ہیلن، ایلن کہاں ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ ضرور کوئی بات ہو گئی ہے۔“  
ہیلن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”آؤ۔ کوئی بات نہیں ہے۔“ لیکن ڈیانا پیچھے ہٹ گئی۔

”چارلس کہاں ہے؟“ اس نے تشویش سے پوچھا۔  
”کیا تم چارلس سے نہیں ملنا چاہتی ہو؟“ ہیلن نے کہا۔ ڈیانا نے اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہیلن نہیں تھی جسے وہ ایلن کی بیوی کی حیثیت سے جانتی تھی۔ اس کے چہرے پر خباثت اور شیطانیت کے سائے رقصاں تھے۔ وہ فوراً تیزی سے مڑی اور باہر کی طرف دوڑی۔

ہیلن زور سے ہنسی۔ دروازہ بند تھا۔ سرخ دھاریوں والا سیاہ چغہ پنپے ہوئے بلند قامت ڈریکولا نے اپنے بازو دا کر دیئے اور ڈیانا کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے آگے بڑھا۔ ہیلن اب بھی ہڈیانی انداز میں ہنس رہی تھی۔

ہیلن کی ہنسی کو نظر انداز کر کے ڈیانا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈریکولا کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ لیکن ڈریکولا نے اپنے بازوؤں کی گرفت اور مضبوط کر دی۔ ”ڈریکولا۔ اسے چھوڑ دو۔“ یہ چارلس کی آواز تھی۔ ہیلن لپک کر دروازے کے قریب کھڑی ہو گئی لیکن ڈیانا کی جان میں جان آئی کہ چارلس یہاں موجود تھا۔

ہیلن نے آگے بڑھ کر چارلس کا بازو تھام لیا۔ ”ڈارلنگ، میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں پیار کرنا چاہتی ہوں۔“ چارلس ہیلن کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ بدستور ڈیانا کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ہیلن اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی دوسری طرف ڈریکولا سے ڈر کو چھڑانے کے لیے ڈیانا جدوجہد کر رہی تھی۔

ہیلن کا چہرہ چارلس کے چہرے پر جھکا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے درندگی و وحشت عیاں تھی۔ چارلس اس سے ہاتھ چھڑانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ ڈیانا۔ بمشکل تمام خود کو ڈریکولا کی گرفت سے چھڑایا اور تیزی سے چارلس کے پاس چلی گئی۔

محن میں آ گئے۔ باہر رات کی دھندلی تاریکی میں بگھی اور گھوڑے نظر آ رہے تھے۔ بغیر یک لمحہ ضائع کئے وہ دونوں بگھی میں سوار ہو گئے۔ چارلس نے لگائیں سنبھالیں اور گھوڑے برق رفتاری سے قلعے سے باہر کی جانب دوڑنے لگے۔ قلعے کے صدر دروازے ہن انہوں نے دوسریوں کو ایک دوسرے میں مدغم ہوتے دیکھا۔ یہ ہیلن اور ڈریکولا تھے ایک دوسرے کے گلے میں بانٹیں ڈالے راز و نیاز کر رہے تھے۔

بگھی بے حد تیزی رفتاری سے سڑک پر بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد موت و خوف کے اس قلعے سے دور ہو جانا چاہتے تھے۔ ڈیانا بگھی میں بیٹھی بے حد بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی اور چارلس گھوڑوں کو تیز سے تیز دوڑانے میں مشغول تھا۔ وہ دھڑک رہا تھا کہ کہیں ڈریکولا کسی مافوق الفطرت طریقے سے گھوڑوں کو واپس نہ بلا لے۔

ڈھلان بہت تنگ تھی۔ ایک موڑ پر بگھی مڑی تو بے قابو ہو گئی۔ گھوڑے فضا میں اپنی اگلی ٹانگیں اٹھا کر ہنسنے لگے۔ بگھی کا توازن بگڑ گیا اور اس کے پچھلے فضا میں بلند ہوئے۔ ایک زوردار چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ یہ ڈیانا کی چیخ تھی جو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ بگھی ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو چکی تھی اور اب تیزی سے ڈھلان سے نیچے لڑی اور تاریک کھائی میں گر رہی تھی۔ لیکن یہ سب ڈیانا کا واہمہ تھا۔ وہ بگھی سے باہر رہ چکی تھی۔

پھر جیسے چاروں طرف ہولناک اندھیرا چھا گیا۔ ڈیانا کا جسم بری طرح کسی سخت اور لہار چیز سے ٹکرایا اور جھیل گیا۔ وہ بے حد زخمی ہو گئی اور بے ہوش ہو کر ایک طرف پڑی۔ ہر طرف پراسرار اور ویران سی خاموشی چھا گئی۔

○☆☆○

رات کی تاریکی میں خون کی سرخی کا گہرا رنگ شامل تھا۔ چارلس کا سر بری طرح راتا تھا۔ وہ بھیگی بھیگی گھاس پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں سے خون بہا تھا۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ بری طرح دکھ رہا تھا۔ وہ بڑی مشکوں سے اٹھا۔ اس کا بری طرح چکرا رہا تھا۔ پھر جیسے اس کے دل و دماغ میں ایک ہی سوال گونجنے لگا۔

ڈیانا۔ ڈیانا۔ ڈیانا کہاں تھی؟

چارلس کی گردن میں پیوست کر دیئے۔ وہ تیزی سے چارلس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ چارلس بے بسی سے زمین پر گر جاتا رہا تھا۔

ڈیانا نے ایک چیخ ماری۔ وہ ایک جنونی عورت کی طرح ہیلن سے لڑ رہی تھی۔ وہ دونوں ہال کے وسط میں بری طرح لڑ رہی تھیں۔ ڈیانا کی قمیص تار تار ہو چکی تھی اور جب پر جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ یکایک اس کے گلے میں لٹکی ہوئی سونے کی کراس ہیلن کے بازو سے ٹکرائی۔ اس بار ہیلن درد سے چیخی۔ اس نے ہانپتے ہوئے ڈیانا کو چھوڑ دیا اور خوف زدہ ہو کر الگ ہٹ گئی۔

ڈیانا بھی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ پھر اس کی سمجھ میں سارا معاملہ آ گیا۔ اس نے کراس اپنے ہاتھ میں لی اور اسے ہیلن کی طرف بلند کیا۔ ہیلن لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی۔ وہ بے حد خوفزدہ تھی۔ چارلس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل آئی تھیں۔ ڈریکولا اب بڑے اطمینان سے اس کا گلا گھونٹ رہا تھا اور اسے اذیت اور تکلیف میں دیکھ کر لطف اٹھا رہا تھا۔

ڈیانا چیخی۔ ”چارلس۔ ایک کراس بناؤ۔ جس طرح بھی ہو سکے، کراس کا نشان بنا لو۔“

چارلس ایک طرف جھکا اور ٹوٹی ہوئی تلوار اٹھا کر کراس کا نشان بنالیا۔ پھر اس نے یہ نشان ڈریکولا کے چہرے کے سامنے کر دیا۔ ڈریکولا نے ایک بھیانک چیخ ماری اور چارلس کو چھوڑ کر دور ہٹ گیا۔ وہ بے حد خوفزدہ اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ ڈیانا فوراً ہیلن کی مامکتی ہوئی دوڑ کر چارلس کے قریب پہنچی اور اٹھنے میں اس کی مدد کی۔

وہ دونوں کراس کے نشان اٹھائے ہوئے اٹے پاؤں چلتے ہوئے صدر دروازے کی طرف چل دیئے۔ یکایک ہال میں ایک دروازہ کھلا اور کلوڈ ایک تیز دھار چاقو لئے اندر داخل ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ چاقو سے وار کرتا، چارلس نے بجلی کی سی تیزی سے تلوار کا ٹکڑا اس کی طرف پھینکا۔ کلوڈ کے حلق سے ایک بھیاںک چیخ نکلی اور تلوار کا آدھا سرا اس کے سر میں گڑ گیا۔ وہ بے سدھ ہو کر زمین پر گر گیا۔

چارلس نے ڈیانا کا ہاتھ تھاما اور وہ دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے ہال سے نکل کر

کمرے میں ہلکی سی چرچاہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا اور ایک راہب خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ ”مسٹر کینٹ! تمہاری بیوی خیریت سے ہے۔ وہ بہت کمزور ہو گئی ہے“ لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے وہ ابھی تک سوئی ہوئی ہے۔“

”میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ چارلس نے بے یقینی سے کہا۔ چند دنوں میں اس پر جو قیامتیں گزر گئی تھیں انہوں نے اس کے دل میں ہر بات کا اعتماد ختم کر دیا تھا۔ ”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم قطعی مطمئن رہو۔ وہ جیسے ہی اٹھے گی۔ میں فوراً تمہیں اس سے ملوا دوں گا۔“ راہب نے بڑے یقین سے کہا۔

پھر اس نے چارلس کو بتایا کہ فادر شینڈور اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ وہ لباس تبدیل کر کے اور تازہ دم ہو کر ان کے پاس چلا جائے۔ خود چارلس کو بھی شینڈور سے ملنے کا اور اس موضوع پر تفصیلی بات چیت کرنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور فادر شینڈور کی سٹڈی میں اس سے ملنے جا پہنچا۔

اس نے فادر شینڈور کو ساری رام کہانی کہہ سنائی۔ ”ہو نہ۔“ فادر شینڈور نے سختی سے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔ ”تو ڈریکولا دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نئی نوع انسان پر ایک بار پھر مردہ خبیث عفرتیوں کا راج ہو رہا ہے۔“

فادر شینڈور نے چارلس کو خون آشام درندوں کے بارے میں تفصیلاً بتاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوگ غول کی شکل میں رہتے ہیں۔ تمہارے بھائی کی جان لے کر ڈریکولا زندہ ہوا ہے۔ اب ہیلن اور کلوڈ اس کے خاص کارندے بن چکے ہیں۔“ یہ کہہ کر شینڈور نے ایک کتاب اٹھائی اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔ ”ڈریکولا خون آشام انسانوں کا آخری فرد باقی بچا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ڈریکولا مر چکا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ لیکن اسے زندہ کرنے کے لیے بھی کسی زندہ انسان کے خون کی ضرورت تھی اور یہ کام ایلن کے خون سے لیا گیا۔“

چارلس یہ سب سن کر بے دم سا ہو گا۔ اس کا بھائی مر چکا تھا۔ اچانک اس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ چارلس نے عہد کیا کہ وہ ہر قیمت پر ڈریکولا کو نیست و نابود کر دے گا۔ فادر شینڈور نے اسے تسلی دیتے ہوئے بتایا۔ ”اسے ختم کرنے کے بہت

چند لمحوں تک وہ خالی الذہن ہو کر سوچتا رہا۔ پھر اس نے دیکھا کہ ڈیانا گھاس پر پڑی ہوئی تھی۔ چارلس نے ایک سسکی لی اور ڈیانا کے بے حس و حرکت زرد چہرے کی طرف دیکھا۔ خون اس کے جسم پر جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔ وہ بولا۔ ”ڈیانا!“ لیکن ڈیانا کے جسم کو کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ اس نے ڈیانا کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا دل آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ وہ زندہ تھی اور یہ بات چارلس کے لیے کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ چارلس کے ہاتھ کا پھنکنا۔ اس نے ڈیانا کو اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ وہ بڑی مشکل سے چل رہا تھا لیکن وہ جلد از جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

سوکھی ہوئی شاخیں اس کے قدموں تلے چنچ رہی تھیں۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا اور دل ہی دل میں ڈیانا کی زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اس کی بہت جواب دے رہی تھی لیکن پھر بھی کوئی انجانی قوت اسے بار بار چلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ڈیانا کا چہرہ زرد اور ستا ہوا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں، پیشانی پر خون جما ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ لگا کر ڈیانا کے زرد اور سرد گال کو چھو کر دیکھا اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ اسی لمحے اس نے محسوس کیا جیسے کوئی انسانی سر اس پر جھک رہا ہو۔ اس نے کھڑے ہونا چاہا لیکن ٹانگوں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ویران سائے میں فادر شینڈور کی آواز گونجی۔ ”میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ قلعے کے پاس نہ جا لیکن تم نے میری ایک نہ مانی۔“

چارلس بڑی دقت سے کھڑا ہوا۔ ساری کائنات اسے گھبرمتی ہوئی نظر آ رہی تھی وہ زمین پر گرے ہی والا تھا کہ فادر شینڈور نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے تھام لیا۔ جب چارلس کو ہوش آیا تو وہ ایک نرم اور آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں چند دوسری ضروریات زندگی کی چیزیں رکھی تھیں اور ایک کونے میں چھوٹی سی میز اور آ کرسی پڑی تھی۔ یہ کسی ہوٹل کا کمرہ نہیں تھا۔ چارلس اس وقت کلین برگ کے گرجا میں تھا۔

آکھ کھلتے ہی وہ چیخا۔ ”ڈیانا۔ ڈیانا کہاں ہے؟“ وہ اٹھنے کی کوشش میں ایک بار

سے طریقے ہیں۔ دن کے وقت اس کی کمین گاہ تلاش کی جاسکتی ہے اور وہ تابوت میں لیٹا ہوتا، اسی میں اس کے سینے میں میخ گاڑ کر اسے ختم کیا جاسکتا ہے۔ کراس کے ذریعے جلا کر ہلاک اور خاکستر کیا جاسکتا ہے۔ غرضیکہ اسے تباہ کرنے کے بے شمار طریقے ہیں۔ وہ غیر فانی ہرگز نہیں ہے۔“

فادر شینڈور نے چارلس کو بتایا لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ہے کیونکہ قلعے سے متعلق بہت سے لوگ ڈریکولا کی مدد کریں گے اور ویسے بھی اس کا خاص مصاحب کلوو ہر قیمت پر اپنے آقا کی مدد کرنا اپنا اولین فرض سمجھے گا۔ شینڈور نے کہا۔ ”ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ خون آشام انسان بڑھنے نہ پائیں۔ انہیں محدود رکھنے اور ختم کرنے کے لیے ڈریکولا کا خاتمہ بے حد ضروری ہے۔ اس حیوانی نسل کے خاتمے میں ہی بنی نوع انسان کا عافیت ہے۔“

پھر شینڈور چارلس کو ڈیانا کے پاس لے گیا۔ چارلس نے محسوس کیا کہ خون آشام لوگوں سے بچنے کے لیے اس گر جاگھر سے محفوظ جگہ اور کوئی نہیں تھی۔ ڈیانا ایک پلنگ پر ہلکا سا کیبل اوڑھے آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ اس کے چہرے پر اب بھی زردی کھنڈر ہی تھی۔ چارلس کا دل بھر آیا۔ وہ ابھی تک بے ہوشی تھی۔ اس نے تیزی سے کمرے سے باہر نکل کر فادر شینڈور کے دونوں بازو تھام لئے۔ ”آپ..... آپ تو کہہ رہے تھے وہ بالکل ٹھیک ہے!“

”ہاں میرے بچے میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ چوبیس گھنٹے کے آرام کے بعد وہ اس قابل ہو جائے گی کہ تم اس سے دل بھر کر باتیں کر سکو۔ تمہیں فکر مند ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ آخر میں جو یہاں ہوں!“

چارلس چند لمحے کچھ سوچتا رہا، پھر یک لخت اس نے پشیمان ہو کر فادر کے ہاتھ چھو دیئے اور اس کے ہمراہ اس کے کمرے میں چلا آیا۔

اسی گر جاگھر کے ایک راہب لڈوگ نے بھی چارلس کو تفصیلی طور پر ان سات باتوں کے بارے میں بتایا کہ کس طرح خون آشام درندے دن کے وقت اپنی کمین گاہ کا آرام کرتے ہیں اور کیسے رات کے وقت تاریکی میں اپنے شکار کی تلاش میں مارے مارے

بہرتے ہیں۔ اسی دوران برادر مارک (ایک اور راہب) نے فادر شینڈور کو کسی گاڑی بان کے آنے کی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”فادر“ ایک گاڑی بان آیا ہے۔ وہ کہتا ہے میں بہت ٹھکا ہوا ہوں۔ رات یہاں گزارنا چاہتا ہوں۔“

فادر شینڈور مسکرایا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”درست ہے عام حالات میں ناید گر جاگھر کے دروازے ہر آدمی کے لیے، ہر اجنبی کے لیے کھلے تھے لیکن اب حالات مت سنگین اور مختلف ہیں۔ اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ہو سکتا ہے رات کو ڈریکولا ادھر آ نکلے لیکن وہ اندر گر جاگھر میں آنے کی جرات ہرگز نہیں کر سکے گا۔“

پھر اس نے چارلس سے کہا۔ ”گزشتہ شب ڈریکولا اپنے شکار یعنی ڈیانا سے محروم رہ گیا تھا۔ ہیلن بھی اس معاملے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکی تھی۔ اس لیے وہ ڈیانا کو پناہ شکار بنانے کے لیے تڑپ رہا ہو گا۔ بہر حال وہ اگر یہاں آ بھی گیا تو اندر نہیں آئے گا۔ نض لسن کے پھول ہی لٹکا دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر پہلے سے عمارت میں موجود کوئی روح کسی خون آشام کو بلانا چاہے تو پھر دنیا بھر کے لسن کے پھول بھی اسے وہاں آنے سے نہیں روک سکتے۔“

کچھ وقت گزرنے کے بعد چارلس دوبارہ اپنی بیوی ڈیانا کو دیکھنے گیا۔ وہ ابھی تک آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ چارلس اس کے بیڈ کے قریب بیٹھ گیا۔ ڈیانا نے آنکھیں کھولیں اور محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے چارلس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے اپنے گال کے ساتھ رگڑ کر رونے لگی۔ چارلس نے جھک کر اس کے بال چوم لئے۔ گھر جانے کا تذکرہ سن کر ڈیانا کے چہرے پر رونق آ گئی۔ لیکن جب چارلس نے دوبارہ سے بتایا کہ وہ واپس قلعے میں ایک بار ضرور جائے گا اور ڈریکولا سے اپنے بھائی کی موت کا انتقام لے گا تو وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی۔ ”نہیں نہیں۔ تم ہرگز وہاں نہیں جاسکتے۔ میں مرجاؤں گی لیکن تمہیں وہاں نہیں جانے دوں گی۔“ وہ بری طرح ہلک کر رو رہی تھی۔

فادر شینڈور نے کمرے میں آ کر اسے دلاسا دیا۔ ”چپ ہو جاؤ میری بچی۔ اس

بے اختیار کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔ برفانی ہوا کا ایک سرد جھونکا اندر آیا اور ایک تیز طرار بلی کی طرح ہیلن لپک کر اندر آگئی۔ اندر آتے ہی اس نے سفاکی اور درندگی سے ڈیانا کی کلائی جکڑ لی اور اس سے پہلے کہ ڈیانا چیخ سکتی اپنے دانت اس کی کلائی میں گاڑ دیئے۔

ڈیانا زور سے چیخی۔ ہیلن نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور جیسے فضا میں تحلیل ہو گئی۔ اسی لمحے کھڑکی کے فریم میں ڈریکولا کا خبیث سراپا نمودار ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے جیسے ڈیانا کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لیے بے تاب ہو۔ ڈیانا فرش پر گرنے لگی اور پھر اس نے خود کو چارلس کے بازوؤں میں گرا ہوا پایا۔ ”کیا ہوا؟“ یہ فادر شینڈور کی آواز تھی۔ فادر نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی۔ پھر وہ مڑا اور ڈیانا کے دونوں شانے پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا۔ وہ اسے بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔ ڈیانا نے بے بسی سے اپنی کلائی فادر کی طرف بڑھا دی۔ چارلس کی آنکھیں فرط حیرت اور خوف سے باہر کی طرف اہلی ہوئی تھیں۔

فادر شینڈور نے چارلس سے ڈیانا کو تھامنے کے لیے کہا۔ ڈیانا کی کلائی پر دانتوں کے دو گہرے نشان تھے جن پر خون کی دو بوندیں سرخ یا قوت کی طرح چمک رہی تھیں۔ فادر نے کونے میں رکھا ہوا لیپ اٹھایا اور ان نشانوں پر لیپ کی لور رکھ دی۔ ڈیانا کا چہرہ درد اور تکلیف کی شدت سے سیاہ ہو گیا۔ یہ تکلیف اور اذیت اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ خود کو چارلس اور فادر کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے تڑپنے لگی۔ ”فادر بس کیجئے۔ خدا کا واسطہ اس پر رحم کیجئے۔“ چارلس نے شینڈور سے التجا کی لیکن فادر شینڈور ڈیانا کی التجاؤں اور چیخوں سے بے نیاز اپنے کام میں تندہی سے مگن رہا۔ سرد ہوا نے زخم میں جیسے مرچیں سی بھردی تھیں اور اب آگ سے جھلس جانے کے بعد جلد میں خوفناک جلن ہو رہی تھی۔ ڈیانا نے ایک سسکی لی اور بے ہوش ہو گئی۔

جب اسے ذرا ہوش آیا تو برادر مارک اور فادر شینڈور اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اس کی کلائی میں اب پہلی سی آگ نہیں تھی۔ اس پر کوئی ملامت، ٹھنڈی اور سکون بخش مہم لگا دی گئی تھی۔ ”کیا گر جاگھر میں کوئی اور اجنبی موجود ہے؟“ فادر شینڈور نے سختی سے پوچھا۔ برادر مارک نے نرمی سے انکار میں سر ہلایا۔ ”ہم نے آپ کے احکامات پر سختی

حالت میں تمہیں زیادہ سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ تم سکون سے سو جاؤ۔“ پھر فادر نے چارلس کا بازو تھاما اور اسے باہر لے گیا۔ ڈیانا نے انہیں آواز دینی چاہی پھر تھک کر اپنا سر تکتے پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

فادر نے چارلس سے کہا کہ وہ جا کر سکون سے سو جائے۔ گر جاگھر ایک قلعے سے زیادہ مضبوط اور محفوظ ہے اور اسے یا اس کی بیوی ڈیانا کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ باہر برف گر رہی تھی اور ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ رات کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ دروازوں کو سختی سے لوٹ کر دیا گیا اور کھڑکیوں پر پردے گرا دیئے گئے تھے۔

○☆☆○

ڈیانا کے لیے یہ پناہ گاہ ایک قید خانہ بن کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دوبارہ ڈریکولا کے قلعے میں قید کر دی گئی ہو۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی اوپر چھت کی طرف ٹمٹکی باندھے گھور رہی تھی کہ کھڑکی کے شیشوں پر کسی کی دستک کی آواز سنائی دی۔ کسی نے تین بار کھڑکی پر دستک دی۔ ڈیانا خوفزدہ ہو کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

باہر ہلکی ہلکی سی دھند تھی اور اس دھند میں کھڑکی کے قریب ایک بیمار اور ستا ہوا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ یہ ہیلن تھی۔ ڈیانا کانپنے لگی۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ساکت سی ہو گئی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

”پلیز..... پلیز.....“ ہیلن کے خون آلود ہونٹ کانپے۔ ڈیانا بند سے اتری۔ اس کے پاؤں ٹھنڈے فرش پر لگے تو اس کے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ ڈیانا کسی غیر مرئی کشش کے زیر اثر کھڑکی کے قریب کھینچتی چلی گئی۔ ہیلن کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور اس کی آواز شیشوں میں سے سرگوشی کی طرح اندر آرہی تھی۔ ”پلیز۔ ڈیانا میں تم سے التجا کرتا ہوں۔ مجھے اندر آ جانے دو۔ میری اچھی بہن باہر بہت سردی ہے۔ میں مرجاؤں گی۔ ڈیانا جھجکی۔ وہ سوچ رہی تھی کاش وقت چارلس یا فادر شینڈور اس کے قریب ہوتے، ہیلن بدستور آہ و زاری میں مصروف تھی۔ ”اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ میں ڈریکولا کو قید سے فرار ہو گئی ہوں۔ مجھے بچالو۔ مجھے اندر آنے دو۔“ ہیلن پھر کھکیائی۔ ڈیانا۔

کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اس سے کبھی نہ مل سکے گی۔ ڈریکولا کی جنسی رفاقت اور شیطانی دنیا اس کی فتنہ تھی۔ اس نے ایک اور چیخ ماری اور اس کی چیخ راہداری میں دور تک گونجتی چلی گئی۔

○☆○

فادر شینڈور چارلس کو لئے ہوئے گرجا گھر کے صحن میں چلا آیا۔ یہاں ایک بگھی پر دو تابوت رکھے ہوئے تھے۔ ان تابوتوں میں فادر نے دو کراسیں رکھ دیں تاکہ دن کے وقت ڈریکولا اور ہیلن اپنی کمین گاہوں کا استعمال نہ کر سکیں۔ فادر شینڈور نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے کوچبان کو گرجا گھر کے باہر بھی آخر کیوں ٹھہرنے دیا۔ یہ سب کچھ اس مردود ڈریکولا کے خبیث ملازم کلوو کا کیا دھرا ہے۔ ہمیں جلد از جلد اسے بھی تلاش کرنا ہوگا۔ یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ ہیلن بھی یہیں کہیں چھپی ہوگی۔ ہمیں جلد از جلد اسے بھی تلاش کرنا ہوگا۔ اگر اس سے پہلے اس نے کسی اور کو کاٹ لیا تو وہ بھی ڈریکولا کا شکار ہو جائے گا۔ ہم اس معاملے میں کوئی رسک نہیں لے سکتے۔

اس اثناء میں دو پادریوں نے آکر بتایا کہ ہیلن کو تلاش کر لیا گیا ہے۔ وہ اصطبل میں چھپی ہوئی تھی۔ فادر شینڈور نے ہیلن کو لڈوگ کے تہ خانے میں لے جانے کا حکم دیا اور پھر چارلس کو لے کر پھر گرجا کی طرف چل دیا۔ اندر پہنچ کر جونہی چارلس کی نگاہ ہیلن کے دہشتناک چہرے پر پڑی وہ ہر چیز بھول گیا۔ اسے ساری دنیا گھومتی ہوئی معلوم ہوئی۔ یہ کسی زندہ عورت کا چہرہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ ایک زندہ لاش کی مانند تھی۔ اپنی ان دیکھی قوتوں کے ساتھ خود کو چھڑانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ چار آدمیوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ آخر اسے کھینچ کر ایک چوڑی سی میز پر گرادیا گیا۔

چارلس نے منہ پھیر لیا وہ اس نظارے کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ فادر شینڈور نے کونے میں رکھی ہوئی تقریباً ایک فٹ لمبی لکڑی کی نوکیلی اور تیز میخ اٹھائی اور ہیلن کی بائیں چھاتی پر دل کے قریب رکھ دی۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر زیر لب کچھ دعائیں پڑھیں اور کونے میں رکھی ہوئی وزنی بتسوزی اٹھا کر فضا میں بلند کی۔ ایک

سے عمل کیا ہے۔“ پھر مارک جھک کر ڈیانا کی کلائی پر پٹی باندھنے لگا اور فادر شینڈور چارلس کو مطمئن رہنے کی تسلی دینے لگا۔ ”خطرہ ٹل گیا ہے میرے بچے۔ ڈیانا بالکل ٹھیک ہے۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔“ شینڈور کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

شینڈور اور چارلس کے جانے کے بعد کمرے میں ڈیانا کے پاس بچھی ہوئی ایک کرسی میں برادر مارک بیٹھ گیا۔ ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ مارک نے دروازہ کھولا تو لڈوگ اندر آیا۔ اس نے بتایا کہ شینڈور نے ڈیانا کو اپنی سنڈی میں بلایا ہے۔ وہ اور چارلس ڈیانا کو کسی خاص معاملے پر بات چیت کرنے کے لیے وہاں بلا رہے ہیں۔ مارک نے اس بات پر احتجاج کیا لیکن فادر شینڈور کے حکم سے سرتابی کی مجال اسے نہیں تھی۔ بادل خواستہ اس نے ڈیانا کو لڈوگ کے ہمراہ جانے کی اجازت دے دی۔ لڈوگ تیزی سے ڈیانا کو لئے ہوئے فادر شینڈور کی سنڈی کی طرف بڑھا۔ جونہی ڈیانا اندر داخل ہوئی اس نے باہر سے دروازہ لاک کر دیا۔

دیوار کی طرف منہ کئے ڈریکولا کھڑا تھا۔ ڈیانا کا فتنہ ڈریکولا مڑا اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے اور اپنی مقناطیسی آنکھیں ڈیانا کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ ڈیانا بے بسی کے عالم میں اس کی مقناطیسی آنکھوں کی قوت سے مسحور اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ڈریکولا نے ہاتھ بڑھایا اور سامنے سے ڈیانا کی فیض ناف تک پھاڑ دی۔ پھر اپنے لمبے ناخنوں سے اس کا سینہ لہولہا کر دیا۔ ڈیانا کی چھاتیوں سے خون رسنے لگا۔ ڈریکولا نے اپنا بازو ڈیانا کی کمر میں حائل کر دیا سر سینے پر جھکا دیا۔ پھر اس نے اپنے بھیاںک اور خبیث ہونٹ ڈیانا کے سینے پر رکھ دیئے۔ خون کا تیز ذائقہ اس کی زبان پر چر کے لگانے لگا۔

ڈیانا اب اپنے آپ کو ڈریکولا کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنی پوری قوت یکجا کر کے مدد کے لیے چیختی۔ دور گر جا کے کسی کونے میں چارلس کی آواز ابھری۔ ”ڈیانا..... ڈیانا!“ پھر کمرے کی ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور فرش پر شیشے کی کڑیاں بکھرنے لگیں۔ یہ سب کچھ ڈیانا کو ایک بھیاںک خواب کی طرح محسوس ہ رہا تھا۔ ڈریکولا اسے دور بہت دور لئے جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ چارلس



کے اجالے میں ڈریکولا اپنے تابوت میں آرام کرے گا اور یہ تابوت کلوو اس کے لیے تیار کرے گا۔ جب تک شام کی تاریکی نہ پھیل جائے۔ ڈریکولا ڈیانا کے پاس نہیں جائے گا۔ اس وقت تک کلوو ڈیانا کا پہرہ دیتا رہے گا۔ تم شاید یہ نہیں جانتے کہ ڈریکولا کا قلعہ یہاں سے پورے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے۔“

پھر شینڈور نے چارلس کی رائفل بھری اور اسے دے دی۔ پھر کہا۔ ”ہو سکتا ہے کلوو کو ہم اپنے فائدے کے لیے استعمال کر سکیں۔ بہر حال ہمیں کچھ اور میٹھوں کی ضرورت بھی ہوگی۔ تم اور مارک گھوڑے سنبھالو اور میں اپنی تیاری کرتا ہوں۔ دن کی روشنی آہستہ آہستہ ہر طرف پھیل رہی تھی۔ اس تلکے اجالے میں آگے بڑھتے ہوئے کبھی کے نشانات انہیں بہ آسانی نظر آرہے تھے۔ چارلس کے دل و دماغ میں سوائے ڈیانا کے کوئی اور بات نہیں تھی۔ وہ بدستور اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

چارلس بہت تیزی سے گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ اس کے دل کو عجیب سی بے چینی اور بے قراری نے گھیر رکھا تھا۔ انہیں سفر کرتے ہوئے دوپہر ہو گئی تھی۔ گھوڑے تھک کر بری طرح ہانپ رہے تھے۔ پھر سہ پہر کے وقت روشنی آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو گئی۔ چارلس نے سسکی لی۔ ”ہم وہاں کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ اف میرے خدایا۔ ڈیانا کی حفاظت کرنا۔“

کبھی ناقابل یقین رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ شینڈور نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے ڈھلان کو دیکھا اور گھوڑے کی لگائیں کھینچ لیں۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ برف پوش پہاڑوں سے اتر کر ان ڈھلوانوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ فادر شینڈور اور چارلس نے اپنے گھوڑے درختوں کے ساتھ باندھ دیئے۔ ابھی وہ سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ قلعے کی طرف جانے والی سڑک پر کبھی کے پہیوں اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز گونجنے لگی۔ کبھی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ کلوو اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے کبھی بے تابوت رکھے ہوئے تھے۔ چارلس نے رائفل کا رخ کلوو کی طرف کر دیا۔ کلوو کا منہ اس غیر معمولی صورت حال پر کھلا رہ گیا۔ اس نے گھوڑوں کی لگائیں کھینچ لیں۔ شینڈور نے سے کبھی سے نیچے آنے کا حکم دیا لیکن کلوو اپنی سیٹ پر سے ہلے بغیر ہی پلک جھپکتے میں

بھیانک چیخ نے پوری عمارت کو لرزادیا۔ چارلس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ ہیلن کا جسم اس طرح تڑپا جیسے مچھلی بن پانی کے تڑپتی ہے اور پھر ساکت ہو گیا۔

چارلس دوسرے پادریوں کے ساتھ ہیلن کی لاش کے قریب گیا۔ اب وہ بے حد پرسکون نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک معصوم اور دلکش مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس جنمی ہیلن کا کوئی پتہ نہ تھا جو چند لمحوں پہلے ان لوگوں سے خود کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ ابھی وہ لوگ کمرے سے باہر جانا ہی چاہتے تھے کہ فادر شینڈور کا پاؤں لوہے کی ایک سلاخ سے ٹکرایا جو زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ ”ہونہ۔ تو یہ لڈوگ یہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا۔“ شینڈور نے کھڑکی سے اکھڑی ہوئی سلاخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ابھی وہ لوگ یہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ دور گر جاگھر میں سے کسی کی چیخ نے ان کے قدم روک لئے۔ یہ ڈیانا کی آواز تھی۔ چارلس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

وہ سب تیزی سے اندر کی طرف دوڑے۔ فادر شینڈور نے اپنی سٹڈی کا دروازہ کھولا۔ اندر ڈریکولا ڈیانا کو اپنے بازوؤں میں سنبھالے کھڑکی سے باہر کودنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے ایک زقند لگائی اور باہر کھڑی ہوئی کبھی میں چڑھ گیا۔ کوچبان کی سیٹ پر کوئی آدمی منہ ڈھانپے بیٹھا تھا۔ یہ کلوو تھا جو اپنے آقا کی خدمت بجالانے کے لیے یہ کبھی یہاں لایا تھا۔ ڈریکولا نے تیزی سے ڈیانا کو کبھی میں پھینکا اور کلوو کو ایک طرف دھکا دیتے ہوئے گھوڑوں کی لگائیں سنبھال لیں۔ چابک فضا میں لہرایا اور گھوڑے برق رفتاری سے آگے بڑھے۔ کچھ فاصلے پر لڈوگ کھڑا ڈریکولا سے التجائیں کر رہا تھا کہ وہ اسے بھی ہمراہ لے جائے لیکن ڈریکولا نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑھکتا ہوا ایک طرف اوندھے منہ جاگرا اور وہاں اسی دیر میں کبھی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

○☆○

فادر شینڈور نے لڈوگ کو مارک اور دوسرے لوگوں کے حوالے کیا اور چارلس کے ہمراہ اندر گر جاگھر میں آ گیا۔ ”اس وقت صبح ہونے والی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”دن

ہاتھ سے رائفل چھین لی۔ اسی دوران ڈریکولا تابوت سے باہر آچکا تھا اور اب اپنی تمام خباثتوں کے ساتھ پوری طرح چارلس پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

ڈریکولا نے چارلس کا بازو جکڑ لیا اور اسے برف پر گھسیٹنے لگا۔ گولی چلنے کے ساتھ ہی ان سے چند گز کے فاصلے پر ایک تودے میں بڑا سا شگاف ہو گیا۔ پانی کا ایک فوارہ اس شگاف سے پھوٹنے لگا۔ فادر شینڈور نے چلا کر کہا۔ ”بالکل ٹھیک ہے۔ ایک گولی اور چلاؤ۔“ ڈیانہ نے لگاتار فائرنگ شروع کر دی۔ وہ اندھا دھند گولیاں برسا رہی تھی۔

ڈریکولا نے چارلس کا خیال چھوڑ دیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر فادر شینڈور اور ڈیانہ کو زور سے دھکا دیا۔ اسی دوران ایک گولی اور چلی۔ چارلس برف پر پھسل کر گرا پھر اٹھ کر دوڑا اور پھر گر پڑا۔ گرتا پڑتا وہ ڈیانہ اور شینڈور کی مدد کے لیے دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ جونہی وہ ڈریکولا کے نزدیک پہنچا برف کے پتھنچے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس کے ساتھ ہی وہ جگہ جہاں ڈریکولا کھڑا ان پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا ایک بھیانک آواز کے ساتھ شق ہو گئی۔ ڈریکولا ڈوبنے سے بچنے کے لیے ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ وہ بے حد پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ ایک اور گولی چلی۔ برف کا ایک اور تودا ٹوٹ کر علیحدہ ہو گیا۔ نیچے سے بخ ٹھنڈا پانی ابل ابل کر اوپر آ رہا تھا۔

جگہ جگہ شگاف پڑ چکے تھے اور ہر طرف پانی کے فوارے چل رہے تھے۔ چارلس بری طرح ہانپ رہا تھا۔ وہ جلد از جلد اوپر ڈیانہ کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن وہ بری طرح تھک چکا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے۔ شیطانی طاقتوں سے برسویکار رہنے کے بعد اس میں اب پل تک جانے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔

شینڈور نے بندوق ڈیانہ کے ہاتھ سے چھین لی اور نشانہ لے کر ایک اور دھماکہ خیز فائر کیا۔ اس بار یہ گولی بہترین جگہ لگی کہ برف کا وہ تودا جس پر ڈریکولا کھڑا تھا، دریا سے شق ہو گیا۔ خون آشام ڈریکولا نے ایک خوفناک چیخ ماری اور اپنی استخوانی بانہیں بل کی طرف پھیلا دیں۔ وہ اس چھوٹے سے پل کا کوئی نہ کوئی سرا پکڑنے کے لیے بری طرح کوشش کر رہا تھا لیکن موت اس کا مقدر بن چکی تھی۔

ڈیانہ نے شینڈور کی مدد سے چارلس کے بازو تھامے اور اسے اوپر کھینچ لیا۔ پھر

شینڈور کی طرف کود کر لپکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمک دار خنجر تھا۔ چارلس نے فوراً ٹریگر دبا دیا۔ گولی کلوو کے سینے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ لڑھکتا ہوا زمین پر آگرا اور خنجر اس کے ہاتھ سے دور جاگرا۔ دونوں گھوڑے کبھی کو کھینچتے ہوئے برق رفتاری سے ان کے قریب سے گزرے اور قلعے کی طرف چل دیے۔ بجلی کی سی تیزی سے چارلس اور فادر شینڈور نے اپنے اپنے گھوڑے کھولے اور کبھی کے تعاقب میں ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

کبھی ایک طرف کو بھگی اور اس پر رکھا ہوا ایک تابوت زمین پر جاگرا۔ چارلس اور شینڈور نے اپنے گھوڑے روکے اور تابوت کے قریب جا کر اس کا ڈھکنا ہٹا دیا۔ تابوت میں ڈیانہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں بھیانک انداز میں پھٹی ہوئی تھیں۔ چارلس نے سمجھا کہ شاید وہ بھی ڈریکولا کا شکار ہو چکی ہے لیکن اسی لمحے ایک آنسو ڈیانہ کے رخسار پر بہہ نکلا اور وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔ چارلس اس کی طرف لپکا لیکن فادر نے اس کا بازو تھام لیا۔ ”تم جاؤ۔“ میں اس کی حفاظت کروں گا۔ جاؤ جلدی کرو۔ روشنی کم ہوتی جا رہی ہے۔“ شینڈور نے تقریباً چیخ کر کہا۔ چارلس زمین پر گرے ہوئے دوسرے تابوت کی طرف بڑھا۔ تابوت برف کی موٹی سی تہ پر پڑا ہوا تھا۔ یہ ڈریکولا کا تابوت تھا۔ ڈریکولا۔ رات اور تاریکی کے سحر کا بادشاہ۔

اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ چارلس تابوت کے قریب پہنچا اور دونوں کندھے کھول دیے۔ فادر شینڈور پل کے نزدیک ڈیانہ کے ہمراہ کھڑا ہوا تشویش ناک انداز میں چارلس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ تابوت کا ڈھکنا ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور ایک استخوانی ہاتھ باہر نکلا۔ لوہے کی طرح سرد اور سخت انگلیاں چارلس کے ہاتھ سے ٹکرائیں۔ ڈیانہ نے ایک زوردار چیخ ماری۔ چارلس نے قدم جمائے تاکہ ڈریکولا سے دست بدست لڑائی کر سکے۔

”گولی چلاؤ۔“ تم گولی کیوں نہیں چلاتے؟“ فضا میں ڈیانہ کی چیخ گونجی لیکن چارلس جانتا تھا کہ گولی چلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ چارلس نے دیکھا کہ ڈیانہ نے شینڈور سے

## عفريت محل

عفريت محل ایک بہت وسیع عمارت تھی۔ دور سے ایک بڑے دیو کے بھولے کی طرح نظر آتی تھی۔ اس عمارت پر عجیب سی ویرانی اور وحشت چھائی رہتی۔ اگر کبھی کوئی بھولے سے عمارت کی طرف نکل جاتا تو اس عمارت کو دیکھتے ہی خوف کی ایک شدید لہر اس کے بدن میں دوڑ جاتی۔ یوں محسوس ہوتا کہ ویران محل میں سے کوئی عفریت نمودار ہونے والا ہے۔ بعض اوقات محل کے اوپر چمکدار اڑتیاں یا محل کے چاروں طرف گھنے جنگل میں گیدڑوں کے بھونکنے کی بھیانک آوازیں سنائی دیتیں۔ لوگوں کے کہنے کے مطابق عفریت محل بدروحوں اور عفریتوں کا مسکن تھا کیونکہ کئی بار محل کے قریب سے حسین لاشیں اڑنے کی نیم برہنہ لاشیں ملی تھیں۔ ان کے گلے پر دو سوراخ ہوتے جن سے خون

انہوں نے دیکھا کہ ڈریکولا، تاریکی کا شہزادہ، بے بسی اور لاچارگی سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ برف درمیان سے شق ہوتے ہی وہ نیچے ہی نیچے کھنچا چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے برف کے پانی پر اس کا مکروہ چہرہ سطح پر ابھرا۔ اس نے منہ کھولا اور بھیانک انداز میں مین کرنے لگا جیسے وہ ہزاروں بدروحوں کو اپنی مدد کے لیے پکار رہا ہو۔

پھر پانی کا ایک زوردار ریلہ آیا اور ڈریکولا برف کے اس بھنور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گم ہو گیا۔ برف کا ایک بڑا سا گلیشئر تیرتا ہوا اس خلاف میں آ گیا۔ اور برف کی سطح برابر ہو گئی۔ چارلس ڈیانا اور شینڈور بے یقینی کے عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس جگہ کو دیکھ رہے تھے جو اب ڈریکولا کا مدفن بن چکی تھی۔

وہاں اب سطح پر سرخ دھاریوں والا ایک سیاہ چغہ تیر رہا تھا۔ وہ لوگ سوچ رہے تھے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کاریتھیا کی یہ بلا مکمل تباہی سے اب بھی بچ نکلی ہو۔ لیکن چند لمحوں بعد برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں نے اس حقیقت کا اعتراف کر لیا تھا کہ کاؤنٹ ڈریکولا مر چکا تھا۔ وہ کبھی نہ آنے کے لیے جا چکا تھا۔ اس جہنم میں جہاں ہزاروں بدروحیں خدا کے عذاب میں گرفتار اس کے خیر مقدم کو منتظر تھیں۔

○☆☆○

میں ڈوبا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے دوسرے لوگوں کو ہال نما پورچ میں رکنے کی ہدایت کی اور خود بڑے دروازے کی طرف بڑھا۔

کمروں میں داخل ہونے والے تمام دروازے مقفل تھے۔ ڈاکٹر نے فشر کو آواز دے کر اپنے قریب بلایا اور جہاں جزیئر لگا ہوا تھا اس جگہ کا راستہ دریافت کیا۔ فشر ڈاکٹر کو ساتھ لے کر عمارت کے عقبی حصے میں گیا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں جزیئر لگا ہوا تھا۔ فشر نے جزیئر شارٹ کر دیا۔ ہر طرف روشنی پھیلنے لگی۔ ڈاکٹر نے آکر بڑے دروازے کا قفل کھولا تو دروازہ چڑچڑاہٹ کے ساتھ کھلا۔ اندر بڑا سا ہال تھا۔ عمدہ قسم کے پرانے طرز کے صوفے اور قالین بچھے تھے۔ دیگر آرائشی سامان لگا ہوا تھا۔ ہر چیز اس طرح گرد آلود تھی جیسے اسے برسوں سے صاف ہی نہ کیا گیا ہو۔ بڑے بڑے گلدانوں میں جانے کتنے برسوں کے مرجھائے ہوئے پھول تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں پر گرد کی تھیں جی ہوئی تھیں۔ قالین دھول سے اٹا ہوا تھا۔ وہ اوپر کی منزل کی طرف بڑھنے کے لیے بیڑھیوں پر چڑھے۔ دوسری منزل پر انہوں نے کمرے کھول کر دیکھے۔ ہر کمرے میں دیرانی اور وحشت برس رہی تھی۔ چاروں افراد نے ایک بڑے کمرے کو استعمال کے لیے منتخب کر لیا۔ ڈاکٹر لائونو بیئرٹ اور فشر اپنا سامان درست کرنے لگے۔ این اور ٹینا باورچی خانے میں جا کر کھانا تیار کرنے لگیں۔ کھانا تیار ہوا تو سب لوگوں نے ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا۔

ٹینا نے برابر میں ایک دوسرے کمرے کو اپنے لیے منتخب کر لیا۔ اس کمرے میں ایک وسیع و عریض بستر بچھا ہوا تھا جس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ ٹینا نے کمرے کا جائزہ لیا۔ سرہانے کی جانب ایک میز پر تین بڑی موم بتیاں لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکی پر موٹا پردہ پڑا تھا۔ کھڑکی کے سامنے قد آدم آئینہ دیوار میں نصب تھا اس کے پاس ایک قدیمی طرز کی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ ٹینا نے اپنا لباس اتارا اور آئینے کے سامنے انگڑائی لے کر اپنے سفید و گداز جسم کا جائزہ لیا اور گاؤن پن کر بستر پر لیٹ گئی۔ بستر پر لیٹتے ہی سرور انگیز بھنی بھنی خوشبو نے ٹینا کو تھکنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں میں ٹینا گہری نیند میں ڈوب گئی۔ آدمی رات کا وقت تھا کہ ٹینا کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ اس نے کھڑکی میں دیکھ

رستا ہوا ملکہ ان زخموں کو دیکھ کر یوں لگتا کہ کسی درندے نے یا کسی آسیب نے گردن سے خون چوسا ہو۔ بعض لاشوں کو اس قدر بری طرح اڑھڑا گیا ہوتا کہ شناخت کرنا مشکل ہو جاتا۔ کسی تیز ناخن یا آہنی سریے سے انسانی جسم کے گوشت کو اڑھڑا دیا جاتا۔ اس سے ظاہر ہوتا کہ جو کوئی بھی ہے بہت ہی تشدد پسند ہے۔

ڈاکٹر لائونو بیئرٹ ایک یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ انہیں سائنس میں وسیع معلومات تھیں۔ وہ اکثر مختلف تجربات کرتے رہتے تھے۔ خطرناک مہمیں سر کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے دلیر، زندہ دل انسان تھے۔ اسی بناء پر انہیں عمر رسیدہ مارک لاسن نے اپنے یہاں مدعو کیا تھا اور انہیں سائنسی طریقے سے آسیب پر تحقیق کرنے کے لیے کہا تھا بھیاک عفریتوں نے ابتداء ہی سے پرسکون زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ سائنسی طریقے سے انسان کو بھیاک عفریت اور آسیب سے نجات دلائی جائے۔ اس کے لیے اس نے ڈاکٹر لائونو بیئرٹ کو پانچ ملین ڈالر کی پیش کش کی۔ ڈاکٹر بیئرٹ کو آسیب پر یقین نہیں تھا انہوں نے پیش کش قبول کرنے سے معذرت کی مگر مارک لاسن نے انسانیت کا واسطہ دیا اور اس قدر اصرار کیا کہ ڈاکٹر لائونو بیئرٹ کو مارک لاسن کی پیشکش قبول کرنی پڑی۔ تحقیق کے لیے کسی ایسے مقام کی ضرورت تھی جہاں عفریت یا چڑیل بھوت کی موجودگی کا یقین ہو۔ مارک لاسن نے کافی سوچ بچار کے بعد عفریت محل پہنچے۔ عفریت محل میں پانی، بجلی اور ڈاکٹر بیئرٹ مکمل تیاری کے بعد عفریت محل پہنچے۔ عفریت محل میں پانی، بجلی اور

دوسری ضروریات کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ مارک لاسن نے ڈاکٹر کی مدد کے لیے مسٹر فشر کو ساتھ کر دیا۔ فشر مارک لاسن کا قریبی عزیز تھا۔ وہ چند دن اس خوفناک محل میں گزار چکا تھا۔ پہلے تو فشر نے ہنسنے ہوئے ڈاکٹر بیئرٹ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا لیکن جب ڈاکٹر نے سمجھایا بھلیا اور اس کا خوف دور کیا تو وہ ڈاکٹر کا ساتھ دینے پر راضی ہو گیا۔ جب یہ لوگ عفریت محل کے قریب پہنچے تو این کی ایک دوست فلورنس ٹینا انہیں ملی۔ جب اسے ڈاکٹر کی اس انوکھی تحقیق کا علم ہوا تو وہ بھی بطور تفریح ڈاکٹر کے ساتھ ہو لی۔ شام دھندلنے میں ڈاکٹر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عفریت محل کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ یہ قدیم زمانے کی ایک بلند و بالا ہیبت ناک عمارت تھی۔ اس وقت محل گہری تاری

اپنی زندگی چاہتے ہو تو اس قصر سے فوراً نکل جاؤ۔ دوسری صورت میں تمہارا بھی وہی حشر ہوگا جو تم سے پہلے تحقیق کے لیے آنے والوں کا ہوا ہے۔ یہ میری طرف سے پہلی اور آخری وارننگ ہے۔ اس کے بعد تم اپنی زندگی اور موت کے خود ذمہ دار ہو گے جس شخص کو اپنی زندگی عزیز ہو وہ یہاں سے فوراً نکل جائے۔ میں زندہ ہوں مگر تم مجھے تلاش نہیں کر سکتے۔ میری تلاش بے سود ہے۔ مجھے تلاش کرنے والوں کا انجام انتہائی بھیانک ہوگا۔ زندگی چاہتے ہو تو اس قصر سے فوراً نکل جاؤ۔ فوراً نکل جاؤ۔“

ڈاکٹر بیرٹ نے کہا۔ ”یہ سب بلاسکو کا مکرو فریب ہے۔ وہ مرچکا ہے اور اب یہ قصر قابل رہائش ہے۔ یہاں کسی کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ مارک لاسن نے مجھے بتایا ہے کہ بلاسکو نے سائنسی طریقے سے یہاں ایک سائنسی عفریت بنایا ہے جو نظر نہیں آتا۔ دوسرے الفاظ میں کوئی خفیہ مشین ہے جو ریڈیائی شعاعیں فضا میں منتشر کر کے انسانوں کو خوفزدہ کرتی ہے۔ میں اپنے سائنسی طریقے سے اس کے عفریتی اثرات ختم کر دوں گا۔ پھر یہاں سکھ چین سے زندگی بسر کی جاسکے گی۔“

فشر نے کہا۔ ”یہ ناممکن ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بلاسکو مرچکا ہے مگر اس کا بیٹا میکل زندہ ہے اور اب یہ سب حرکتیں وہی کر رہا ہے۔ میں واضح کر دیتا چاہتا ہوں کہ یہاں رہنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ۱۹۳۷ء میں اس مکان میں ۶۵ افراد تحقیق کرنے کے لیے آئے تھے۔ ایک رات سب کے سب ہلاک ہو گئے اور ۱۹۳۹ء میں شکاگو ہینورسٹی کے دو پروفیسر جن میں سے ایک فزکس اور دوسرا کیمسٹری میں پی ایچ ڈی تھا، ماں آئے تھے۔ ایک رات ان پر اچانک پراسرار حملہ ہوا جس کے نتیجے میں ایک پروفیسر را گیا اور دوسرا مفلوج ہو گیا جو چند دن بعد ہسپتال میں تڑپ تڑپ کر مر گیا اور ۱۹۵۳ء میں ۵۰ افراد تحقیق کے لیے یہاں آئے تھے جن میں خود میں بھی شامل تھا۔ ایک رات نام لوگ ہلاک ہو گئے صرف میں زندہ بچا تھا اور ایسا لگتا ہے جیسے اس بار بھی صرف میں نا زندہ بچوں گا۔“ اس کے باوجود وہ یہ کہتے ہوئے بڑا خوفزدہ لگ رہا تھا۔ اس کی یہ بات ان کر سب پر خوف طاری ہو گیا لیکن ڈاکٹر بیرٹ کے اطمینان دلانے پر ان کی ڈھارس نہی۔ رات کی تاریکی میں ماحول بڑا پراسرار لگ رہا تھا۔ کمروں میں جگہ جگہ رکھے

ایک بڑا سا کالا پرندہ بجز پیرا رہا تھا۔ شاید وہ اندر آنا چاہتا تھا۔ یٹنا یہ سمجھی کہ پرندہ اپنے گھونسلے میں آنا چاہتا ہے۔ ذرا دیر تک پرندہ کھڑکی کے سامنے اڑتا رہا، پھر غائب ہو گیا۔ پھر ایک ہولناک نسوانی چیخ سنائی دی جیسے کسی دوشیزہ کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہو۔ اس چیخ کی آواز پر ڈاکٹر لائونو بیرٹ، این اور فشر بھی اٹھ گئے۔ یٹنا فوراً گھبراہٹ کے عالم میں کمرے میں سے باہر نکلی۔ باہر تینوں موجود تھے۔ چاروں نے تمام کمروں کو دیکھا لیکن کہیں کسی ذی روح کا نام و نشان نہ تھا۔ پھر وہ سب باہر نکلے ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ زرد چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ گراہی پلاٹ خشک پڑے ہوئے تھے۔ درخت بھی کچھ زیادہ سرسبز نہیں تھے۔ ڈاکٹر نے عفریت محل کے مختلف حصوں کو دیکھ ڈالا مگر کہیں بھی کچھ نہ ملا۔ سامنے عفریت محل کے ہی ایک حصے میں ایک چھوٹا سا گر جا گھر تھا۔ ڈاکٹر اور اس کے ساتھی گرجے میں گئے۔ گرجے کے ہال میں سائے حضرت عیسیٰؑ کا قد آدم مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ مجسمے کے قریب موم بتیاں روشن تھیں گرجے کی چھت سے کئی قیمتی فانوس لٹک رہے تھے۔ جلد ہی ڈاکٹر لائونو بیرٹ اور باقی تینوں افراد گرجے سے نکل کر رہائشی عمارت کی جانب چل دیے اور ایک کمرے میں اکٹھا ہو کر صوفوں اور آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے۔ اچانک این کو احساس ہوا۔ یٹنا غائب ہے۔ وہ خوف سے چلائی۔ ”یٹنا! تم کہاں ہو یٹنا؟“ یہ کہتی ہوئی این گھبرا کر یٹنا تلاش کرنے کی غرض سے دوسرے کمروں کی طرف دوڑی۔ دوسرے افراد بھی این۔ پیچھے ہو لئے۔ این خوف و دہشت سے مسلسل چلا رہی تھی۔ ”یٹنا۔ یٹنا۔“ اچانک یٹنا کو گوشے سے نکل کر سامنے آکھڑی ہوئی۔ این اس سے لپٹ گئی۔ ”اوہ میں تو ڈر ہی تھی۔ تم کہاں غائب ہو گئی تھیں؟“

”کیس نہیں۔ تم تو خواہ خواہ ڈرتی ہو۔ یہاں کوئی آسیب نہیں ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”میں برابر دالے کمرے میں تھی وہاں سے مجھے یہ شپ ملا ہے۔“ یہ کہہ کر انے نے ٹیپ ڈاکٹر بیرٹ کی طرف بڑھایا۔ پھر سب لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ٹیپ لگے۔ ٹیپ سے آواز سنائی دی۔ ”میں بلاسکو بول رہا ہوں۔ یہ قصر میری ملکیت ہے۔

گزرتی ہوئی سڑک پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ باہر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ایک کار سامنے سے آتی نظر آئی جسے ایک بڑھیا ڈرائیو کر رہی تھی۔ بڑھیا کے ساتھ اس کی نوجوان خوبصورت بیٹی ایلین تھی۔ یہ دونوں ماں بیٹی اپنے شوہر اور باپ سے ملنے ہسپتال جا رہی تھیں۔ تاریکی میں سڑک پر جب بوڑھا عورت کی نظر ایک دوشیزہ پر پڑی تو وہ کار روک کر باہر نکلی تاکہ اس بے سہارا دوشیزہ کی مدد کر سکے۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کی بیٹی ایلین بھی کار سے اتر آئی۔ این ان کی طرف بڑھی۔ اس نے اس قدر زور سے بوڑھی عورت کو پیٹ میں لات رسید کی کہ وہ کار سے جا نکل گئی۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ خون کا فوارہ ایلین کے لہجے اور وہ چند ہی لمحوں بعد مر گئی۔ اب وہ ایلین کی طرف بڑھی اور آنا فانا میں این نے اپنے لیے اور تیز ناخنوں سے ایلین کی قمیض نوچ کر پھاڑ ڈالی اس کے سینے کا بیشتر حصہ عیاں ہو گیا۔ اس نے جان بچانے کے لیے دوڑنے کی کوشش کی لیکن این نے اسے دبوچ کر اس کے سینے پر اس زور سے دانت مارا کہ خون کا فوارہ ابل پڑا۔ وہ درد سے تڑپنے اور مچلنے لگی اور زور زور سے مدد کے لیے چلانے لگی مگر وہاں اس کی آہ و بکا اور چیخ و پکار سننے والا کوئی نہ تھا۔ این اس کے سینے سے ابلتا ہوا تازہ خون مزے لے کر پینے لگی۔ ایلین درد کی تاب نہ لا کر اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے نڈھال ہو گئی۔ اب این اس کے جسم پر جگہ جگہ گردن، کندھے اور پیٹ پر کاٹ کاٹ کر خون پینے لگی۔ ایلین زخموں کی تاب نہ لا کر اسی وقت ہلاک ہو گئی اور این اس کی لاش کو سڑک پر ہی چھوڑ کر عفریت محل کی طرف واپس چل دی وہ خود کو پہلے سے کہیں زیادہ تر و تازہ اور شاداب محسوس کر رہی تھی۔

ہنسی مسکراتی لبوں سے خون پونچھتی ہوئی عفریت محل کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوئی اور راہداری سے گزر کر سامنے والے کمرے میں پہنچی جہاں فشر پریشانی کے عالم میں ٹھل رہا تھا۔ اچانک فشر کی نظر این پر پڑی۔ وہ اسے اس حالت میں دیکھ کر بڑا حیران اور پریشان ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ باہر سے آ رہی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”این تم باہر کیا کرنے گئی تھیں؟ اتنی رات گئے تمہیں تنہا باہر نہیں جانا چاہئے تھا۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو ڈاکٹر بیرٹ جیتے جی مرجائیں گے۔“

ہوئے سیاہ رنگ کے مجتھے بڑے خوفناک لگ رہے تھے۔ ان مجتھوں کے منہ کھلے تھے اور لال لال زبانیں اور تیز چمکدار سفید دانت دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی حملہ آور ہوئے۔ اچانک ڈرائنگ روم میں رکھے ہوئے گلدان حرکت کرنے لگے۔ اس کے بعد چند دوسری ساکت رکھی ہوئی چیزوں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ سب افراد خوف سے تھر تھر کانپنے لگے۔ یہ صورت حال دیکھ کر ڈاکٹر بیرٹ نے ٹینا سے کہا۔ ”ٹینا! یہ سب تمہاری شعبہ بازی ہے۔ تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔“

ٹینا نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔ ”میں..... میں تو خود خوفزدہ ہوں اور حیران ہوں کہ آخر یہ کیا اسرار ہے۔ نہ جانے کون سی قوت ہے جو نظر نہیں آتی لیکن ہمیں خوفزدہ کر رہی ہے۔“ اس کے اتنا کہتے ہی سب چیزیں ساکت ہو گئیں اور کمرے میں مکمل سکون ہو گیا۔ تب سب لوگ اپنے بستروں میں چلے گئے۔

رات کا آخری پہر تھا کہ اچانک این کی آنکھ کھل گئی۔ نہ جانے کیوں اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک ایک جھٹکے اور آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور ہوا کا تیز جھوٹا اندر آیا۔ کھڑکیوں کے پردے پھر پھڑپھڑانے لگے جیسے کوئی پراسرار چیز اندر داخل ہوئی ہو۔ مارے خوف کے این کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے کئی بار ڈاکٹر بیرٹ کے کندھے، کمرے کے مارے اور اسے جگانے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر گہری نیند سو رہا تھا۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ جوں کا توں سوتا رہا۔ این خفگی سے بغور دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی اتنا ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی خوفناک پراسرار جسم سے بے نیاز چیز کمرے میں داخل ہوئی، جسے وہ دیکھ نہیں سکتی تھی، صرف محسوس کر سکتی تھی۔ این کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ سانس رکتا ہوا محسوس ہوا، دماغ ماؤف ہو گیا اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ چند ہی لمحوں میں این کو محسوس ہوا کہ وہ پراسرار شے اس کے جسم میں سرایت کر رہی ہے۔ پھر وہ مکمل طور پر اس کے اندر سرایت کر گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ پراسرار آسیب کے تابع ہو گیا ہو۔ وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے خود کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن باہر رہی۔ اس کا چہرہ انتہائی خوفناک ہو گیا تھا۔ آگے کے دو دانت باہر نکل آئے تھے۔ جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی اور پھر بڑے دروازے سے نکل کر کچھ روش پر



دو ایک خوبرو دوشیزہ کی لاش تھی جس کے کپڑے تار تار ہو گئے تھے۔ یہ ایلن تھی جس کے جسم پر ناخنوں اور تیز نوکیلے دانتوں کے کاٹنے کے متعدد نشانات تھے۔ خون نکل جانے کے باعث اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ شکل مسخ ہو چکی تھی۔

”آپ نے کل رات یہاں کوئی مشتبہ شخص تو نہیں دیکھا؟“ انسپکٹر نے سوال کیا۔  
 ”جی نہیں۔ رات میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ بس ابھی باہر نکلا ہوں۔“ ڈاکٹر بیرٹ نے مغموم لہجے میں کہا۔ ”مجھے اس حادثے کا دلی افسوس ہے۔“ اس کے چہرے پر افسردگی بٹنے لگی۔

پولیس انسپکٹر نے دوشیزہ ایلن کی لاش کے زخموں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے مجرم نے مقتولہ کے ساتھ بیدردی سے تشدد کر کے اس کا خون بھی پیا ہے اور پھر میں روپوش ہو گیا ہے۔“

”قدموں کے نشان بھی موجود نہیں ہیں۔“ سپاہی نے لقمہ دیا۔  
 ڈاکٹر بیرٹ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”یہ خونی مجرم خواہ مرد ہو یا عورت یقیناً ڈریکولا نسل سے تعلق رکھتا ہے۔“

”ڈریکولا کو مرے تو صدیوں گزر چکی ہیں۔“  
 ”پھر بھی ممکن ہے کہ اس کی نسل کا کوئی فرد ابھی تک زندہ ہو۔“ ڈاکٹر نے کچھ مابعد میں کہا جیسے اسے اپنی بات کا پختہ یقین ہو۔

لاشوں کو پولیس دین میں ڈال کر پوسٹ مارٹم کے لیے لے جایا گیا اور ڈاکٹر بیرٹ پنے کمرے میں لوٹ آیا۔ وہ بہت فکر مند تھا لیکن اس نے یہ بات دوسرے افراد سے شیدہ رکھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ باقی افراد بھی اس دلخراش واقعے سے پریشان یا خوفزدہ ل۔

این اور ٹینا نے ناشتہ تیار کر کے میز پر جن دیا۔ چاروں افراد کھانا کھانے بیٹھے تو نک پلیٹیں حرکت کرنے لگیں۔ خوفناک مجستے حرکت میں آ گئے۔ کئی پلیٹیں ہوا میں اڑ کر اسے جا ٹکرائیں۔ اس حیرت ناک واقعہ سے سب افراد خوف سے کانپنے لگے۔ ایک ن فشر کے منہ سے اس قدر زور سے نکلایا کہ فشر کی ناک سے خون بہہ نکلا اور پھر

این نے فشر کی بات سنی ان سنی کر دی اور اسی لمحے اپنا شب خوابی کا لباس اتار کر فشر کی طرف بڑھی۔ اب اس کا عیاں بدن فشر کی نظروں کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں لیکن پھر فوراً ہی فشر نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوری قوت سے این کے خوبصورت گلابی رخسار پر تھپڑ رسید کیا۔ تڑاخ سے آواز پیدا ہوئی اور اسی لمحے این کو محسوس ہوا کہ اس کے اندر سے پراسرار شے نکل چکی ہے اور اب اس کا دماغ اور حواس پہلے جیسے ہو چکے تھے۔ اس نے خود کو فشر کے سامنے عیاں کھڑے پا کر بڑی شرمندگی اور حجاب محسوس کیا اور فوراً ہی اپنا شب خوابی کا لباس اپنے جسم پر پہن کر فشر سے اپنی حرکت کی معافی مانگی۔ ”اوہ سوری فشر!“

”یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا تھا؟“ فشر نے حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبے سے دریافت کیا۔

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ”یقین کرو فشر! میں جانتی تھی کہ میں غلط حرکت کر رہی ہوں لیکن نجانے وہ کون سی طاقت تھی جو مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ شاید مجھ میں کوئی آسیب سرایت کر گیا تھا اور میں اس کے ہاتھوں بالکل بے بس ہو گئی تھی۔“

”اچھا خیر! اب سو جاؤ۔“ فشر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ این حیران و پریشان گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچتی ہوئی اپنے بستر تک پہنچی جس پر ابھی تک ڈاکٹر بیرٹ بے خبر سو رہا تھا۔ این بیرٹ کے برابر لیٹ گئی اور جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

○☆○

صبح ایلن کی لاش پولیس کی تحویل میں تھی۔ ایک سپاہی نے عفریت محل کے صدارت دروازے پر دستک دی تو ڈاکٹر بیرٹ باہر نکلا۔

”سامنے سڑک پر دو عورتوں کی لاشیں پڑی ہیں۔“ سپاہی نے بتایا۔  
 ”اوہ!“ ڈاکٹر بیرٹ نے حیرت سے کہا۔ ”چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“  
 سپاہی ڈاکٹر بیرٹ کو اپنے ہمراہ لے کر جائے واردات پر پہنچا۔ ڈاکٹر بیرٹ لاشوں کو بغور دیکھا۔ ایک بوڑھی عورت کی لاش تھی جس کے سر پر شدید ضرب آئی تھی

اچانک میز الٹ گئی اور دروازے کھڑکیاں ہوا سے کھل گئے۔  
 ٹینا بھی ایک کرسی پر سمٹی بیٹھی خوف سے کپکپا رہی تھی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”نہیں۔“

اس کے اتنا کہتے ہی ہر شے ساکت ہو گئی اور مکمل سکون ہو گیا۔

ڈاکٹر بیرٹ نے غصے سے ٹینا کی طرف دیکھا جیسے وہ اسے قصور وار سمجھ رہا ہو۔

ٹینا نے خفگی سے کہا۔ ”میں کچھ نہیں جانتی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

”یہ سب تمہاری شعبہ بازی ہے۔“ ڈاکٹر بیرٹ نے سختی کے ساتھ کہا۔

”ہرگز نہیں۔“ یہ کہہ کر ٹینا غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اب میں یہاں ایک

بھی نہیں رہوں گی۔“ وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ فشر بھی اس کے ہمراہ واپس چلنے کے تیار ہو گیا۔

اس پر ڈاکٹر نے معذرت کی اور انہیں تسلی دی۔ ”ابھی ذرا حوصلہ رکھو۔ کچھ

بعد ہم سب واپس چلیں گے۔ اس وقت تک یہ مکان قابل رہائش ہو چکا ہو گا۔“ ڈاکٹر

اصرار پر دونوں کو اپنا فیصلہ ترک کرنا پڑا۔

دن گزر رات آئی۔ ڈاکٹر کے سوا باقی تینوں افراد خوفزدہ تھے۔

ٹینا سونے کے لیے اپنے کمرے میں آئی۔ خفگی کے عالم میں اس نے کمرے کا

لیا۔ کمرے میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں تھی جس سے خوف محسوس ہو۔ ٹینا نے سفید

کو پٹروں سے آزاد کیا اور کھڑکی کھول کر نظارہ کرنے لگی۔ چاند ابھی پوری طرح نکلا

تھا۔ چلی سطح پر ہونے کی وجہ سے چاندنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ درختوں کے گ

سائے پھیلے ہوئے تھے۔ ہر طرف مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ٹینا چند لمحے کھڑکی

کھڑے ہونے کے بعد اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ چا

روشنی میں ٹینا کا جسم بے حد حسین لگ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا سرسرا نے لگی۔ ٹینا پر غ

چھا گئی۔ ابھی وہ گہری نیند میں نہیں پہنچ پائی تھی کہ اسے آہٹ سنائی دی جیسے کوئی

سے کمرے میں کودا ہو۔ ”کون؟“ ٹینا نے خوفزدہ لمحے میں پوچھا۔

اچانک ایک کالی بلی اس پر حملہ آور ہوئی۔ خوف سے ٹینا کی چیخ بلند ہوئی اور

ابن اور ڈاکٹر بیرٹ کے کانوں میں پہنچی جو ابھی تک جاگ رہے تھے۔ وہ دونوں اس کی مدد کے لیے دوڑے آئے۔ ٹینا کے کمرے میں پہنچ کر انہوں نے دیکھا ایک خونخوار بلی جس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ تھیں، ٹینا کے کندھے پر سوار بار بار اپنے نوکیلے پنجے ٹینا کے رخساروں اور گردن پر مار رہی ہے۔ تکلیف سے ٹینا چیخ رہی تھی۔ فشر بھی پیچھے پیچھے دوڑا آیا تھا۔ اس نے یہ خوفناک منظر دیکھا تو بلی کو پکڑنے کے لیے جھپٹا مگر بلی برق رفتاری سے کھڑکی میں سے چھلانگ لگا کر غائب ہو گئی۔ ٹینا کے نرم نرم سرخ رخساروں اور خوبصورت گردن کی جلد ادھر گئی تھی اور زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ ابن نے جلدی سے ٹینا کو نائٹ گاؤن پہنایا اور فوراً فرسٹ ایڈ کا بسکٹ لاکر اس کے زخموں پر مرہم پٹی کی۔ اپنے کمرے میں لا کر برانڈی پلائی اور اپنے بستر کے قریب ٹینا کا بستر لگا دیا۔ زخموں میں ٹھنڈک پہنچی تو ٹینا سو گئی مگر ڈاکٹر بیرٹ اور ابن جاگتے رہے۔

صبح ٹینا اٹھی مگر رات کے واقعہ سے بے حد خوفزدہ تھی۔ اسے اب عفریت محل

سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ابن نے اسے باہر نکلنے کے لیے کہا تاکہ اس کا دل بہل

جائے۔ ٹینا راہداری میں سے گزری تو سامنے وہ کمرہ تھا جس کے دروازے کا رنگ بالکل

سیاہ تھا۔ دروازے پر سیاہ موٹی موٹی میخیں گڑی تھیں۔ ٹینا خود بخود دروازے کی طرف

بڑھی اور آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ بھیانک چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔ ایک

بست بڑی چمکدار چینی ہوئی پر پھر پھڑپھاتی ہوئی باہر نکلی جس سے فضا خوفناک ہو گئی۔ دوسرے

لمحے ٹینا نے بڑی زور سے چیخ ماری۔ اس بار پھر ڈاکٹر بیرٹ، ابن اور فشر اس کی آواز سن کر

دوڑے آئے۔ کمرے میں بری طرح مسخ شدہ لاش دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ استخوانی

جہرے پر کہیں کہیں ذرا سا سوکھا ہوا گشت تھا۔ مقتول کا لباس قدیمی طرز کا تھا۔ لمبا کوٹ،

سر پر اونچا ہیٹ، لباس پر جگہ جگہ خون کی پٹریاں جمی ہوئی تھیں۔ اس بھیانک منظر کو دیکھ

کر سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ فشر بولا۔

”اوہ! یہ بلاسکو کا بیٹا میکلیں ہے جسے دشمنوں نے مار ڈالا تھا۔ جس کا انتقام بلاسکو اس

محل میں آنے والے ہر شخص سے لیتا ہے۔“

ابن نے بھی تائید میں کہا۔ ”اوہ گاڈ! نجانے بلاسکو اب تک کتنے لوگوں کو ہلاک کر

اب چگاڑ چیتی ہوئی اس پر حملہ آور ہوئی۔ اس سے پہلے کہ چگاڑ اپنے لمبے پنجوں سے ٹینا کے حسین چہرے کا گوشت نوچ ڈالتی، بستر کی چادر خود بخود اڑ کر ٹینا کے اوپر آگری۔ ٹینا بے حد گھبرا رہی تھی۔ چگاڑ مسلسل ٹینا کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ ٹینا چیخنے لگی۔

”نہیں..... نہیں بلاسکو نہیں..... مجھے چھوڑ دو.....“

چگاڑ ہوا میں معلق ہو کر ٹینا پر پھر حملہ کے لیے پر تول رہی تھی کہ سامنے رکھا مجسمہ حرکت میں آگیا۔ مجسمے کے ہاتھ میں تیر کمان تھا۔ تیر کا رخ چھت کی طرف تھا۔ بجلی کی تیزی سے تیر کمان سے نکلا اور چگاڑ کے سینے میں پوسٹ ہو گیا اور وہ کرمسہ چیخ مار کر فرش پر آگری۔ چند لمحے تڑپ کر وہ مر گئی۔ فرش پر ڈھیروں خون بکھر گیا جیسے کسی جانور کو بچ کر دیا گیا ہو۔ ٹینا تھر تھر کانپتی مجسمے کی طرف بڑھی اور اس کا بغور جائزہ لیا۔ مجسمہ ماکت تھا۔ ٹینا نے چگاڑ کو اٹھا کر کھڑکی سے نیچے باہر پھینک دیا۔ اسی لمحے کالی ملی غراتی دی آئی اور مردہ چگاڑ کو اٹھا کر لے گئی۔ خوفزدہ ٹینا یہ منظر دیکھتی رہ گئی۔

ٹینا نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ وہ آج بلاسکو کو تلاش کر کے رہے گی۔ ٹینا غصے سے ہالنے لگی۔ ”بلاسکو! آج میں تمہیں تلاش کروں گی۔ بتاؤ تم کہاں ہو؟“

وہ عفریت محل کے کمروں میں چیتی ہوئی پھرنے لگی اور بلاسکو کو تلاش کرنے لگی۔ کمروں میں وہ اسے پکارتی جا رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بلاسکو ضرور موجود ہوگا۔

ٹینا کو بلاسکو کمروں میں نظر نہ آیا تو وہ چرچ میں جا پہنچی اور چرچ کا دروازہ کھولتے دے پکارا۔

”میں آ رہی ہوں بلاسکو“ میں آ رہی ہوں۔“ اسی لمحے چرچ میں سے عجیب قسم کی آوازیں بلند ہوئیں لیکن ٹینا آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔ چاروں طرف غور سے دیکھ کر بلاسکو کو تلاش کرتی رہی۔ حضرت عیسیٰ کے مجسمے کے عقب میں ٹینا کو ایک سایہ سا نظر آیا۔ وہ خوف سے کپکپاتی مجسمے کے قریب پہنچی تو سایہ غائب ہو چکا تھا۔ اچانک مجسمے میں زلزلہ ہوئی اور پھر دھات کا بنا ہوا کئی من وزنی مجسمہ ٹینا کے اوپر آگرا۔ ٹینا کو پیچھے ہٹنے کی ہمت نہ ملی اور وہ مجسمے کے نیچے دب کر شدید زخمی ہو گئی۔ اس کا سر پھٹ گیا اور دماغ بڑی تیزی سے نکلنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ وہ مرجائے گی۔ اس نے مجسمے کے نیچے سے

چکا ہے اور کتنے ابھی اور اس کی شیطانیت کا شکار ہوں گے۔“

اس نے خوف سے کپکپاتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ڈاکٹر بیرٹ نے دونوں عورتوں کو اپنے اپنے کمروں میں جانے کی ہدایت کی اور خود فشر کی مدد سے میکین کے ڈھانچے کو اٹھا کر تابوت میں رکھا اور دونوں اسے اٹھا کر گرجے میں لے گئے۔ ڈاکٹر نے پادری کو میکین کے بارے میں بتایا تو اس پر پادری نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور تابوت کے آگے چلنے لگا۔ وہ جلد ہی قبرستان میں پہنچ گئے۔ پادری نے گورکن کو بلایا اور قبر کھدوائی۔ تینوں نے اپنے ہاتھوں سے میکین کو دفن کیا اور چند لمحوں میں قبر کا منہ بند کر دیا گیا۔



شب کا پہلا پھر گزر چکا تھا۔ عفریت محل چاند کی زرد روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ ہر طرف بھیانک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بیرٹ اور این ایک ہی بستر پر محو خواب تھے۔ فشر اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا اور ٹینا اب پھر اپنے کمرے میں تنہا سو رہی تھی۔ اچانک آہٹ ہوئی جیسے کوئی چرندہ پھر پھڑپھڑایا ہو۔ ٹینا کی آنکھ کھل گئی۔ اس آہٹ پر ٹینا کا دل بری طرح لرزے لگا اور وہ کانپنے لگی۔ اس نے ہمت کر کے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی نظر کھڑکی پر پڑی۔ باہر زرد چاندنی میں کھڑکی کے شیشے پر چگاڑ موجود تھی۔ وہ بار بار پر مار کر کھڑکی کے شیشے توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پہلے تو ٹینا نے بستر پر بیٹھے بیٹھے ہشکار کر چگاڑ کو وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن چگاڑ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ٹینا نے بغور چگاڑ کو دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں ڈراؤنی لگ رہی تھیں، نیچے نوکیلے تھے۔ ٹینا کے ذہن میں خیال ابھرا کہیں وہ خون آشام چگاڑ تو نہیں جو انسانوں کا خون پی کر زندہ رہتی ہیں یا کسی بدروح نے چگاڑ کا روپ دھار لیا ہو۔ وہ کمرے سے بھاگنا چاہتی تھی کہ ایک زور دار چھناکے کے ساتھ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا اور بڑی سی چگاڑ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ٹینا کے سر پر چکر لگانے لگی۔ ٹینا دبی آواز میں خوف و دہشت سے چلائے لگی۔ چگاڑ نے ٹینا کے سر پر چکر لگائے تاکہ اس پر حملہ کر سکے مگر ٹینا نے تکیہ مار مار کر اپنا دفاع کیا۔ ٹینا اپنے دفاع کے لیے اپنے ہاتھوں کو تیزی سے حرکت دیتے دیتے مڑھال ہو گئی۔

نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ وزنی مجتھے کے نیچے بے بس ہو گئی۔ وہ سانس لینے میں دشواری محسوس کر رہی تھی اس نے کسی قدر اپنے جسم کو اوپر اٹھا کر اپنی انگلی خون میں بھر کر مجتھے پر اپنے خون سے B لکھ کر دائرہ بنا دیا۔ اس کے بعد وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسی۔

○☆☆○

اگلی صبح فشر فلورنس ٹینا کو غائب پا کر فکر مند ہوا اور اس کی تلاش میں عفریت محل میں ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ لیکن ٹینا نہیں ملی، اچانک اسے چرچ کا خیال آیا۔ وہ فوراً پلٹ کر چرچ کی طرف دوڑا اور آہنی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ بڑھتے ہوئے اچانک اس کی نظر مجتھے کے نیچے دبی ہوئی پر پڑی۔

حسین ٹینا کا جسم اذیت سے اٹینھ گیا تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”ٹینا!“ اس نے قریب پہنچ کر اس کی نبض دیکھی۔ وہ مر چکی تھی۔ ”اف ٹینا۔ یہ تیر ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی نظر B پر پڑی۔ ”بلا سکو! ہاں۔ میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ بلا سکو ہی تمہارا قاتل ہے۔“

فشر نے اس کی اطلاع ڈاکٹر لائونو بیٹ کو دی تو اسے بہت رنج ہوا اور اس فشر نے اسے دفن کر دیا۔

جائے حادثہ کا معائنہ کر کے فشر کی مدد سے اسے دفن کر دیا۔ اسی روز ڈاکٹر لائونو نے اپنی سائنسی مشین کو سٹارٹ کیا جس نے ریڈیائی لہریں میں منتشر کرنا شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر بیٹ، فشر اور این باہر نکل گئے ریڈیائی لہریں ان کی صحت پر اثر انداز نہ ہوں۔ بہت دیر بعد ڈاکٹر بیٹ اپنی بیوی این فشر کے ہمراہ عفریت محل میں داخل ہوا۔ ”اب یہ قصر قابل رہائش ہے یہاں رہنے کوئی خطرہ نہیں۔“ چند روز تینوں افراد انتہائی سکون سے عفریت محل میں رہے لیکن ایک رات جبکہ ڈاکٹر اور فشر گہری نیند سو رہے تھے کہ اچانک این کی آہٹ سے آنکھ

گئی۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کمرے میں ان کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ ار ڈاکٹر کو اٹھانے کی بہت کوشش کی لیکن ڈاکٹر بیٹ ایسی گہری نیند سویا تھا کہ آنکھ نہ کھول سکا۔ اچانک ایک دھماکے کے ساتھ دروازہ کھلا۔ این غور سے دروازے کی جانب

لگی لیکن اسے کوئی نظر نہ آیا۔ البتہ اسے احساس ہوا کہ ہوا کے جھونکے کی شکل میں کوئی آسیب کمرے میں داخل ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ پھر اس کے جسم میں کوئی چیز سرایت کر گئی اور اس کا جسم اس کے قابو میں نہ رہا اس کے ہاتھ پاؤں خود بخود حرکت کرنے لگے۔ وہ کوشش کے باوجود اپنے جسم کے اعضاء قابو میں نہ کر سکی۔ وہ بستر سے اٹھی اور شب خوابی کا لباس اتار کر پلنگ پر پھیلتے ہوئے بیدار ہوا۔ صدر دروازے کی طرف چل پڑی۔ صدر دروازے پر پہنچ کر وہ نیم عریاں حالت میں ہی عفریت محل سے باہر نکلی اور کچی روش سے گزر کر شاہراہ پر آکھڑی ہوئی۔ سڑک پر ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ بے چینی سے کسی دوشیزہ کا انتظار کرنے لگی۔ اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا کلیجہ پھنسا جا رہا تھا۔ وہ پیاس کی شدت سے بے قرار ہو کر زمین پر زور زور سے پاؤں مارنے لگی۔

شراب خانے سے واپسی پر ایک جوڑے نے شاہراہ پر نیم عریاں عورت کو کھڑے پا کر کار روک دی۔

”اوہ! یہ تو کوئی مظلوم اور بے سہارا معلوم ہوتی ہے۔“ دوشیزہ نے یہ کہتے ہوئے کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ چلو اس بے چاری کی مدد کریں۔“ یہ کہتے ہوئے ڈینیئل کار سے نیچے اتر کر اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب پہنچا تو اس کے بھرے بھرے جسم کو دیکھ کر مدہوش ہو گیا اور بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ این نے بھی اپنے بازو اس کی گردن کے گرد حائل کر دیئے۔ اس پر کیٹھرائٹن پیچھے ہٹ کر کار کے پاس جا کھڑی ہوئی اور اپنے محبوب کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ اسے ڈینیئل کی یہی عادت ناپسند تھی کہ وہ ہر عورت پر فدا ہو جاتا تھا۔ این نے ڈینیئل کی گردن پر بوسہ لیا این کے دو دانت باہر نکل آئے تھے۔

اچانک اس نے اپنے نوکیلے دانت ڈینیئل کی گردن میں گاڑ دیئے۔ اس نے دانت سے اس کی گردن میں کئی زخم کر دیئے جن سے خون رس رہا تھا۔ این لمبی کی مانند آنکھیں بھپکا بھپکا کر خون پینے لگی اس کے بعد این ڈینیئل کو زمین پر پڑا چھوڑ کر کیٹھرائٹن کی طرف

کہ آیا وہ سب حقیقت تھا یا وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ کر بیدار ہوئی ہے۔ وہ ڈاکٹر کے ساتھ پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ ابھی وہ کسی نتیجے پر بھی نہ پہنچی تھی کہ اسے نیند آگئی۔

○☆☆○

اگلا دن خیر و عافیت سے گزرا لیکن اگلی رات کے بارہ بجے جبکہ این اور فشر گہری نیند سو رہے تھے، ڈاکٹر اپنی سائنسی مشین پر پہنچا اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اب یہ جگہ واقعی ہر قسم کے اثرات سے پاک ہو گئی ہے یا نہیں اپنی مشین سٹارٹ کی۔ اثرات بتانے والے میٹر کی سوئی صفر پر آکر رک گئی جس سے ظاہر تھا کہ اس وقت عفریت محل ہر قسم کے برے اثرات سے پاک ہے۔ ڈاکٹر نے خوشی سے خوشنا کمرے کی دیدہ زیب اشیاء پر نظر ڈالی اور پھر سوئی کو دیکھنے لگا۔ سوئی نے اچانک حرکت کی اور دھیرے دھیرے سرکتی ہوئی صفر سے دس، دس سے بیس اور بیس سے تیس کے درجے کی طرف بڑھی۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر خوف سے لرزنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ڈاکٹر کو خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ وہ کپکپاتے ہوئے پیچھے ہٹا۔ شوکیس پر رکھی ہوئی شیشے کی صراحی ایک زوردار دھماکے کے ساتھ بم کی طرح پھٹی اور اس کی کپجوں نے ڈاکٹر بیرٹ کے چہرے کو لوبھان کر دیا۔

صبح کے چار بجے اچانک این کو احساس ہوا کہ وہ بستر پر تنہا سو رہی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی لیکن ڈاکٹر اسے کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ اپنے شوہر کو غائب پا کر نیچے مشین پر پہنچی، مشین بند پڑی تھی اور فرش پر خون کے قطرے جھے ہوئے تھے لیکن ڈاکٹر کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ خوف سے لرزتی ہوئی فشر کے کمرے میں پہنچی۔ فشر گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ بے تحاشا اس کے کندھے پر کچے برسانے لگی۔ ”فشر، فشر“

”کون ہے؟“ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”ڈاکٹر غائب ہے۔ خدا کے لیے اسے تلاش کرو۔“ این روہانسی ہو کر بولی۔

”وہ مشین پر نہیں ہے؟“ فشر آنکھیں ملتا ہوا بولا۔

”نہیں! میں ابھی وہیں سے آئی ہوں۔“ این افسردہ لہجے میں بولی۔

یہ سنتے ہی فشر بستر سے کود کر گرے کی طرف دوڑا۔ این فشر کے پیچھے چل پڑی۔

بڑھی۔ کیتھرائن نے جب اس کے ہونٹوں سے خون ٹپکتا دیکھا تو وہ خوف سے لرزنے لگی۔ اب فرار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ جلد از جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ کار کا دروازہ کھول کر اگلی سیٹ پر بیٹھی اور کار سٹارٹ کر دی لیکن این فوراً ہی چھلانگ لگا کر کار کے عین سامنے آکھڑی ہوئی۔ کار این سے ٹکرا کر اس طرح رک گئی جیسے کسی چٹان سے ٹکرائی ہو۔ کیتھرائن نے کئی ٹکریں ماریں لیکن بے سود۔ این اپنی جگہ سے نہ ہلی اور کار کا اگلا حصہ کسی قدر پچک گیا۔

یہ دیکھ کر کیتھرائن نے کپکپاتے ہاتھوں سے کار کو پیچھے موڑا۔ این ددڑ کر پھر کار کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس بار پھر کیتھرائن نے کار کو بیک کرنا چاہا لیکن پیچھے ایک درخت آگیا۔ اب کیتھرائن لاچار و بے بس ہو کر دروازہ کھول کر سڑک پر بے تحاشا دوڑتی چلی گئی۔ این ہاتھ پھیلائے اس کے پیچھے دوڑی۔ کوئی دو فرلانگ تک کیتھرائن دوڑتی اور مدد کے لیے پکارتی رہی لیکن کوئی اس کی مدد کے لیے نہ آیا۔ اچانک کیتھرائن ٹھوکر کھا کر گری اور این اس پر حملہ آور ہوئی پہلے اس نے اپنے بازوؤں کی گرفت مضبوط کر کے اس کے کپڑے نوچ ڈالے اور پھر اس کے جسم پر جگہ جگہ کاٹ کر اس کا خون پینے لگی۔ جلد ہی کیتھرائن خوف و دہشت اور زخموں کے سبب بے ہوش ہو گئی۔ این کافی دیر تک اس کے جسم سے رسنے والے خون سے لطف اندوز ہوتی رہی حتیٰ کہ کیتھرائن چل بسی۔ این اپنے آپ کو بڑا مسرور اور تروتازہ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کیتھرائن کی لاش کو کندھے پر اٹھا کر چلنا شروع کر دیا جب وہ ڈینیئل کی لاش کے قریب پہنچی تو اسے زمین پر بیٹھ دیا۔ پھر وہ عفریت محل میں داخل ہوئی اور پھاوڑا لے کر واپس لاشوں کے قریب آگئی پھاوڑے کی مدد سے گڑھا کھود کر لاشوں کو دفن کر دیا اور کار سٹارٹ کر کے باہر چھلانگ لگا دی۔ کار دور ایک درخت سے ٹکرا کر رک گئی اور اس کے بعد این بڑی خوشی خوشی عفریت محل میں داخل ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی این کو احساس ہوا کہ اب اس کا جسم بہت ہلکا چھلکا ہو گیا ہے اور اس کے اعضاء اس کے قابو میں ہیں۔ وہ مارے شرم کے تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں پہنچی اور لباس زیب تن کر کے گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگی۔

ڈوبی ہوئی انگلی سے ایک نشان اپنے اور ایک نشان این کے ماتھے پر لگایا اور این کو آنکھیں کھولنے کی ہدایت کی۔ این حیرت سے کتوں کو دیکھنے لگی۔ وہ ان دونوں سے خوفزدہ ہو کر کچھ اس انداز سے پیچھے ہٹ رہے تھے جیسے کوئی انتہائی خوفناک پراسرار قوت ان کے سامنے کھڑی ہو۔ وہ خوف سے پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک کھڑکی سے چھلانگ لگا کر روپوش ہو گئے۔ فشر نے کھڑے ہوتے ہوئے این کو بھی کھڑا کیا اور زور سے چیخا۔ ”بلاسکو، ہوشیار“ میں آ رہا ہوں، میں آ رہا ہوں بلاسکو میں آ رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ این کے ہمراہ آگے بڑھا۔ این یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئی کہ جوں جوں وہ دونوں آگے بڑھتے خونی دائرہ بھی رینگتے رینگتے فرش پر آگے سرکتا جاتا۔ وہ بڑھتے ہوئے سیاہ دیوار کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ خوفناک آوازوں سے گرجا گونجنے لگا لیکن پھر اچانک ایک چھناکے کے ساتھ ایک شیشہ ٹوٹا اور اس کے ساتھ ہی گرجے میں مکمل سکون ہو گیا۔ فشر سیاہ دیوار پر ہاتھ پھیرنے لگا اتفاق سے اس کا ہاتھ ایک ہینڈل سے ٹکرایا۔ اس نے ہینڈل گھمایا تو ایک دروازہ کھل گیا۔ فشر این کو لے کر دروازے کے اندر داخل ہوا۔ سامنے کرسی پر ایک خوفناک شکل کی انسانی اش بیٹھی ہوئی تھی۔

”یہ بلاسکو ہے!“ یہ کہہ کر وہ این کی طرف دیکھنے لگا جس نے خوف سے منہ پھانپ لیا تھا۔ ”ہمت سے کام لو، اب بلاسکو مرچکا ہے۔“ یہ کہہ کر فشر کمرے کی چاروں دیواروں کو غور سے دیکھنے لگا اور پھر اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اوہ! اب سمجھا“ غیب سمجھ گیا۔

”کیا؟“ این نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ سیسے کی دیواریں ہیں۔ کسی بھی قسم کی ریڈیائی لہریں یا شعاعیں ان دیواروں سے نہیں گزر سکتیں۔ بلاسکو موت سے ذرا قبل ان دیواروں کے اندر محفوظ ہو کر بیٹھ گیا۔ موت کے وقت وہ مر گیا لیکن اس کی روح آسمان پر نہ جاسکی۔ ان دیواروں نے اسے روک لیا۔ اس طرح بلاسکو مر کر بھی زندہ رہا اور اس کی ناپاک روح انسانوں کا قتل ام کرتی رہی۔“

اس کے بعد فشر پروفیسر اور بلاسکو کی لاشوں کو این کی مدد سے دفن کر کے مارک

فشر گرجے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ جوں ہی تھوڑا سا آگے بڑھا اس کی نظر ڈاکٹر کی لاش پر پڑی جو ایک آہنی فانوس کے نیچے دبی پڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ یہ این کی چیخ تھی جو یہ خوفناک منظر دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ فشر این کی طرف بڑھانوا این فشر سے لپٹ کر رونے لگی۔

”حوصلہ رکھو، جو ہونا تھا ہو چکا، اب رونا بے سود ہے۔“ یہ کہتے ہوئے این سے جدا ہو کر غصے سے چلایا۔ ”بلاسکو اگر ہمت ہے تو مجھے بھی قتل کر دے۔ بلاسکو مجھے بھی قتل کر دے۔“

این فشر سے چند قدم پیچھے کھڑی تھی۔ اچانک گڑگڑاہٹ ہوئی اور چھت سے لٹکا ہوا ایک آہنی فانوس حرکت کرنے لگا۔ این نے بڑھ کر فشر کو اپنی طرف کھینچ لیا اور فانوس ایک دھماکے کے ساتھ عین اس جگہ آگرا جہاں پہلے فشر کھڑا تھا۔ فشر موت سے بال بال بچ گیا۔ وہ غصے سے چیخا۔ ”بلاسکو میں آ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ مجتھے کے پیچھے سیاہ دیوار کی طرف بڑھا۔ ہوا کے ایک جھونکے نے اسی لمحے فشر کو پیچھے دھکیل دیا۔

”اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ میں تجھ سے مقابلے کا دوسرا طرز بھی جانتا ہوں۔“ یہ کہہ کر فشر نے ڈاکٹر کے خون میں انگلی ڈبو کر جو ابھی تک تازہ تھا اپنے اور این کے گرد فرش پر ایک دائرہ لگایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ این کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بیٹھ گیا۔

”این آنکھیں بند کر لو اور کسی بھی صورت اس خونی دائرے سے باہر نہ نکلنا۔“ یہ کہہ کر وہ آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگا۔ ہنا فانا سامنے سے خونخوار بھونکتے ہوئے آئے اور ان پر حملہ آور ہوئے۔

فشر نے یہ سوچ کر کہ کہیں این خوفزدہ ہو کر دائرے سے باہر نہ نکل جائے این ایک ہاتھ سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کتے دوڑتے ہوئے آئے اور دائرے کی خونی لکیر پر کریوں رک گئے جیسے ان کے سامنے کوئی شیشے کی دیوار حائل ہو گئی ہو۔ فشر بلند آواز سے علم پڑھتا رہا۔ کچھ دیر کتے انتہائی خوفناک انداز میں بھونکتے رہے جس سے این اتنے خوفزدہ ہو گئی لیکن فشر اسے تسلی دینے کے ساتھ ساتھ علم پڑھتا رہا۔ اس نے خون



گیا۔ انہوں نے عفریت محل کے بارے میں طرح طرح کے خوفناک قصے سن رکھے تھے لیکن کبھی ان پر یقین نہیں کیا تھا۔ لاش دیکھ کر سب کی حالت غیر ہو گئی۔

”شاید اسے کسی جنگلی درندے نے ہلاک کیا ہے۔“ ایک دیہاتی بولا۔

”نہیں! اسے ضرور کسی خونی بلائے مار ڈالا ہے اور اس کا خون پی کر روپوش ہو گئی ہے۔“ دوسرے نے کہا۔

”ہو سکتا ہے عفریت محل کا آسیب ادھر آ نکلا ہو۔“ ایک نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”اسے تو بالکل اسی طرح ہلاک کیا گیا ہے جیسے قصے کہانیوں میں ڈریکولا کسی زمانے میں اپنے شکار کو ہلاک کیا کرتا تھا۔“ ایک نیم تعلیم یافتہ نے کہا۔

”فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ کلائیو نے کہا۔ ”اب اس کی لاش کو اٹھا کر گاؤں لے چلو تاکہ کفن دفن کا بندوبست کیا جاسکے۔“ اس پر دیہاتی لوگ آنسو پونچھتے ہوئے اس کی لاش کو اٹھا کر گاؤں میں لے گئے۔ لاش پہنچتے ہی گاؤں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ گاؤں کے سب مرد اور عورتیں بڑے غور سے لاش کے جسم پر لگے ہوئے نشان دیکھ رہے تھے۔ مردوں کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ انتہائی خوفزدہ ہیں اور عورتیں مارے خوف کے کانپ رہی تھیں اور ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں کہ اسے کی آدمی نے دشمنی میں ہلاک کیا ہے یا کسی خونی چڑیل نے؟ سب عورتیں اور مرد بڑی بے چینی سے ایک دوسرے سے اصل بات معلوم کرنے کے خواہشمند تھے کہ آخر اس کا قاتل کون ہے؟ کوئی دشمن آدمی یا چڑیل یا بدروح؟

”اف خدا یا!“ ایک بوڑھی عورت چلائی۔ ”کیا ڈریکولا پھر زندہ ہو گیا ہے؟ نہیں میرے خدا نہیں، ایسا ظلم نہ کر۔ تو ہمیں کس گناہ کی سزا دے رہا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے عورتوں کا برا حال ہو گیا۔ مردوں نے جو اگرچہ خود بھی خوفزدہ تھے عورتوں کو دلاسا دے کر ایک طرف ہٹایا اور اس کی لاش کو ایک کھوت میں بند کیا اور دیگر تمام رسومات پوری کر کے تابوت کو قبر میں اتار کر واپس گاؤں آگئے۔ یہ قبرستان بھی جس میں سونیا کو دفن کیا گیا تھا جنگل کے قریب ہی تھا اور بستی سے نصف کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔

لاسٹن کے پاس پہنچا اور اسے تمام واقعات تفصیل سے سنائے۔ فشر کے کہنے کے مطابق عفریت محل اب ہر قسم کے اثرات سے پاک ہو چکا تھا۔ مارک لاسٹن کو واقعات سن کر بڑا رنج ہوا اور مکان کے بدروح سے پاک ہونے کی خوشی بھی ہوئی۔ اس نے ان دونوں میں انعامی رقم مساوی تقسیم کرنے کی کوشش کی لیکن ان دونوں نے رقم لینے سے انکار کر دیا۔ چند ہی روز بعد صبح سویرے عفریت محل کے قریب پھر ایک لڑکی کی لاش پائی گئی جس کے ساتھ انتہائی ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا گیا تھا اور اس کے جسم پر دانت کے کاٹے کے بہت سے زخم تھے۔ کسی ڈریکولا نے اس کی آبروریزی کرنے کے بعد اس کا تازہ خون پیا تھا اور پھر فرار ہو گیا تھا لیکن کہاں؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ پولیس نے اس کی لاش پوسٹ مارٹم کر کے اسے دفن کر دیا۔

عفریت محل سے ایک میل کے فاصلے پر ایبٹ دلچ نامی ایک گاؤں تھا جس میں بیشتر آبادی کسانوں کی تھی۔ گاؤں کی دو شیرازیں اکثر و بیشتر صبح سویرے ہی موسیہوں کو چارہ پانی دینے نکلتیں اور کچھ دیر بعد اس کام سے فارغ ہو کر گھر لوٹ آتیں۔ ایک روز سونیا کھیت میں جانوروں کو چارہ دینے منہ اندھیرے ہی چلی گئی لیکن کافی دن چڑھنے کے بعد بھی واپس نہ لوٹی تو گھر والوں کو فکر ہوئی (اس کھیت کے قریب ہی گھٹا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ جنگل پار شاہراہ تھی اور شاہراہ کے بعد کچی سڑک تھی، کچی سڑک کے بعد عفریت محل واقع تھا)۔ سونیا کی ماں جس کا نام میری تھا گاؤں کے چند افراد کے ساتھ سونیا کی تلاش میں کھیت پر پہنچی جہاں جانور بندھے ہوئے تھے۔ جانور چارہ کھانے میں مصروف تھے لیکن سونیا کا باؤ و نشان تک نہ تھا۔ میری کو بڑی تشویش ہوئی۔ گاؤں کے لوگ بھی بڑے پریشان ہو گئے اور بھاگ دوڑ کر سونیا کو ادھر ادھر تلاش کرنے لگے۔ کافی جدوجہد کے بعد آخر کار ایک درخت کے پیچھے سونیا پڑی ہوئی ملی۔ وہ مردہ حالت میں تھی اس کی ماں اپنی بیٹی کی حالت دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ گاؤں کے لوگوں نے جن میں ایک انتہائی سنجیدہ اور تعلیم یافتہ شخص کلائیو بھی شامل تھا اس نے لاش کا غور سے معائنہ کیا۔ اس کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے اور اس کے بدن پر جگہ جگہ دانت کے کاٹے کے گہرے زخم تھے۔ تمام کپڑے بھی خون آلود ہو چکے تھے یہ منظر دیکھ کر سب لوگوں پر خوف طاری

اس کے تھوڑی دیر بعد کلائیو اور آسٹرنارچ لئے قبرستان کی طرف چل پڑے۔  
دونوں قبرستان پہنچے تو ہر طرف ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بڑی بڑی جھاڑیوں کے  
مائے خوفناک لگ رہے تھے دونوں آہستہ آہستہ سونیا کی قبر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ  
ایک الو کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ اسی لمحے دور سے گیڈر کے بولنے کی آواز آئی جس  
سے ماحول اور بھی ہیبت ناک ہو گیا۔ دونوں رک گئے۔

کلائیو کہنے لگا۔ ”ہمیں کسی جھاڑی یا قبر کے بڑے کتبے کے پیچھے چھپ جانا چاہئے  
اگر ڈریکولا نے اسے ہلاک کیا ہو گا تو وہ ضرور رات کو قبر سے نمودار ہوگی اور خود بھی  
دیپار بن کر کسی کا خون پئے گی۔“ وہ دونوں جھاڑی کے پیچھے چھپ کر دیکھنے لگے۔ چاند  
کی روشنی ہر طرف بکھری ہوئی تھی ہر قبر صاف نظر آرہی تھی۔

وہ دونوں کافی دیر تک چھپ کر دیکھتے رہے لیکن سونیا کی قبر میں ہلکی سی جنبش تک  
نہ ہوئی۔

”رات کافی ہو چکی ہے۔“ کافی دیر بعد آسٹرنے سردی محسوس کرتے ہوئے کہا۔  
”اب کیا اٹھے گی۔ غالباً اسے کسی درندے نے ہی ہلاک کیا ہو گا۔“ آسٹرنے اپنا خیال  
دہرایا۔

فضا انتہائی خوفناک تھی لیکن وہ دونوں دلیر ہونے کے باعث ہر قسم کے خوف سے  
بے نیاز چھپے رہے اور کبھی کبھی دونوں میں سے کوئی ایک سونیا کی قبر پر نظر ڈال کر انکار میں  
گردن ہلا دیتا۔ انہیں بیٹھے بیٹھے کئی گھنٹے بیت چکے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو نیند کی آغوش میں  
پہنچ جاتا لیکن نیند ان سے کوسوں دور تھی۔ بعض اوقات آسٹرنے کچھ کچھ خوفزدہ لگ رہا  
تھا۔ نارچ کی روشنی سے گرد و پیش کا جائزہ لیتا کہ کہیں کوئی جنگلی جانور نہ آنکے۔ وہ رات  
بھر بیٹھے سونیا کے نمودار ہونے کا انتظار کرتے رہے حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ وہ دونوں ایک  
”دوسرے پر معنی خیز نظر ڈالتے ہوئے سونیا کی قبر پر پہنچے۔ قبرجوں کی توں تھی۔

”اس سے ظاہر ہے کہ اسے کسی درندے نے ہلاک کیا ہے۔“ آسٹرنے بولا۔  
”ہاں۔ غالباً تمہارا خیال درست ہے۔“ کلائیو نے جواباً کہا اور دونوں گاؤں کی  
طرف چل دیئے۔

رات ہو چکی تھی۔ کوشش کے باوجود کلائیو کو نیند نہیں آرہی تھی۔ بار بار اس  
کے ذہن میں سونیا کے قاتل کا خیال آتا اور وہ ہر بار قاتل کے بارے میں سوچنے لگتا۔ کہ  
آخر اس کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟ کیا تاریکی کا شیطان ڈریکولا پھر زندہ ہو گیا ہے؟ وہ  
بڑبڑانے لگا۔ کیا انسانوں کا دشمن اور عورتوں کے خون کا پیاسا پھر زندہ ہو گیا ہے؟ کیا ایسا  
ممکن ہے وہ پراسرار قوت کا مالک ہے اور کئی بار اسے قتل کیا جا چکا ہے لیکن وہ مرنے سے  
قبل اپنا ایک جانشین مقرر کر جاتا ہے جو برسوں بعد اسے نئی زندگی بخش دیتا ہے۔ ڈریکولا  
انسانی خون سے جنم لیتا ہے اور زندگی بھر انسانی خون پیتا رہتا ہے ابھی وہ اسی سوچ میں  
تھا کہ اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی، وہ چونک پڑا۔ ”کون؟“ اس نے پوچھا۔  
”میں ہوں، دروازہ کھولو۔“ آسٹرنے کی آواز آئی۔

”اوہ! آسٹرنے!“ کلائیو نے آسٹرنے کی آواز پہچان لی اور اطمینان کا سانس لیا، دروازہ  
کھول کر آسٹرنے کو اندر بلایا اور دروازہ دوبارہ بند کر لیا۔  
”تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟“ آسٹرنے پوچھا۔

”سونیا کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ کلائیو نے آسٹرنے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”مجھ  
شک ہے کہ یہ قتل کسی انسان نے نہیں کیا۔ قاتل یقیناً کوئی بدروح، جڑیل یا.....“  
”ڈریکولا۔“ آسٹرنے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ذرا سوچو یہ کیسے ممکن ہے۔  
ڈریکولا کو تو مرے ہوئے بھی کئی سو سال گزر چکے ہیں۔ اب تو اس کی ہڈیاں بھی مٹی  
مل کر مٹی ہو چکی ہوں گی۔“

”کیا تم نے نشان نہیں دیکھے؟“ کلائیو نے آسٹرنے سے دریافت کیا۔  
”دیکھے تھے لیکن ہو سکتا ہے کوئی خونی درندہ جنگل سے گھومتا ہوا ادھر آنکلا ہو۔  
”یہ جنگل اتنا گھنا بھی نہیں ہے کہ ایسے خوفناک درندے اس میں ہوں۔“  
”ممکن ہے ایسا ہو۔“

”کیا تم میرے ساتھ قبرستان چلنا پسند کرو گے۔ میں رات کے وقت اس کو

دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور، ضرور۔ کیوں نہیں۔“

جان نے اس کے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کی تو جان کو اس کے بازوؤں میں غیر معمولی طاقت محسوس ہوئی۔ جان نے اپنا ایک ہاتھ چھڑا کر سوچے آن کیا تو بلب روشن ہو گیا۔ جان نے پہلی بار حسینہ کے چہرے پر نظر ڈالی اور اس کے ساتھ ہی وہ سونیا کی بھیانک صورت دیکھ کر خوف سے چیخا اور بے ہوش ہو گیا۔ سونیا نے اپنے باہر نکلے ہوئے دودانت اس کی گردن میں گاڑ دیئے۔ جان کی گردن سے خون بننے لگا۔ سونیا اسے اپنی سرخ زبان اور ہونٹوں سے چوسنے لگی۔

صبح سویرے سوزی جان سے ملنے کے لیے آئی۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو دلزدہ منظر دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ چیخ سن کر جان کے گھر والے بھی ڈرائنگ روم میں آ پہنچے۔ خون آلود بستر پر جان کی عریاں لاش پڑی تھی اس کے جسم کو بڑی بے دردی سے ادھیڑا گیا تھا۔ اس کے شانوں، گردن اور گالوں پر دانت کے کاٹے کے گہرے زخم تھے۔ جان کے گھر والے یہ دلخراش منظر دیکھ کر زار و قطار رونے لگے۔ سوزی دیوار سے ٹکریں مار مار کر نیم بے ہوش ہو گئی۔ اسے کئی گھنٹوں نے صبر کی تاکید کرتے ہوئے تسلی و تشفی دی۔ گاؤں میں کھرام مچ گیا۔ بچے بچے پر زف طاری ہو گیا۔

یہ خوفناک خبر جنگل کی آگ کی طرح پل بھر میں پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ جوں جوں کلائیو نے یہ خبر سنی وہ دوڑ کر آسٹر کے گھر پہنچا اور دروازے پر دستک دی آسٹر دروازہ کھولتے ہوئے کلائیو سے بولا۔ ”اچھا ہوا تم آگئے“ میں تمہاری ہی طرف آ رہا تھا۔“ کلائیو آسٹر کا بے تکلف دوست تھا۔ وہ آسٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے معنی زانظروں سے گھورنے لگا۔ آسٹر نے کہا۔

”تمہارا خیال ہے کہ سونیا.....“

”ہاں سونیا ہی اس کی قاتل ہے۔“ کلائیو نے آسٹر کی بات کاٹ کر کہا۔

”لاش دیکھنے سے پہلے کچھ کتنا قبل از وقت ہو گا۔“ آسٹر نے جواب میں کہا۔

وہ دونوں فوراً ہی جان کے گھر پہنچے اور جان کی لاش کے قریب پہنچ کر اس کا بغور امدہ کرنے لگے۔

جان پال رات کو ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں کھول کر سونے کا عادی تھا کیونکہ ہفتے میں ایک دو بار رات کو چوری چھپے اس کی منگیت سوزی اسے ملنے کے لیے آیا کرتی تھی بہت جلد ان کی شادی ہونے والی تھی لیکن وہ شادی سے پہلے ہی رنگ رلیاں منانے لگے تھے۔ سوزی اکثر رات کو آتی۔ سوزی اور جان آپس میں پیار کی باتیں کرتے رہتے پھر دونوں ایک دوسرے میں کھو جاتے اور صبح سورج نکلنے سے ذرا پہلے سوزی اپنے گھر روانہ ہو جاتی۔

ایک رات جان اپنے ڈرائنگ روم میں لیٹا ہوا سوزی کا انتظار کر رہا تھا اچانک آہٹ سنائی دی۔

”سوزی تم آگئی ہو۔“ یہ کہہ کر جان نے دروازے کی طرف دیکھے بغیر ہی روش گل کر دی۔ چند ہی لمحے بعد ایک نازک اندام حسینہ اس کے پاس آ کر لیٹ گئی۔

”سوزی تم کتنی حسین ہو اور کتنی پیاری!“ اس نے سوزی سے کہا لیکن سوزی نے کوئی جواب نہ دیا۔

”سوزی آج تمہارا بدن پہلے سے کہیں زیادہ نرم و نازک اور حسین لگ رہا ہے۔“ جان نے مستی کے عالم میں سوزی کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ جان کافی دیر تک سوزی میں کھویا رہا۔ پھر سوزی کو اپنے بازوؤں سے آزاد کر کے اس کے برابر ہی لیٹ گیا تاکہ کچھ دیر سانس لے کر تازہ دم ہو سکے۔

مستی کے خمار میں ڈوبے اندھیرے کے باعث جان نے ابھی تک سوزی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اس کا جسم اسے پہلے سے زیادہ تروتازہ محسوس ہو رہا تھا۔ آج وہ حیران رہا تھا کہ آخر سوزی اتنی خاموش کیوں ہے؟

اچانک سوزی بستر سے اچھل کر جان کے اوپر آگئی اور اس کی گردن کے بارے بوسے لینے لگی جیسے اسے جان کی گردن بہت اچھی لگی ہو۔

اچانک جان کو اپنی گردن میں کوئی سوئی چبھتی محسوس ہوئی اس نے کہا۔ ”سوزی ذرا پیچھے ہٹو مجھے پسینہ چھ رہی ہے۔“ لیکن وہ برابر اس سے لپٹی رہی۔ جان بار بار سوزی سوزی پکارا لیکن سوزی نے ایک نہ سنی اور اس کے بوسے لیتی رہی۔

فون کی طرح سرخ تھیں اور دو بڑے دانت نکلے ہوئے تھے۔ آسٹر اور کلائیو ایک دوسرے سے لپٹ گئے اب انہیں اپنے بچاؤ کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ دوسری طرف سے تین مرد کفن پہنے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہے تھے ان میں ایک عورت تھی جس کے سونے والے بال ہوا میں لہرا رہے تھے ان کی آنکھیں بے نور تھیں بلکہ آنکھوں کی جگہ خالی گڑھے تھے۔ عورت کے دو دانت باہر نکلے ہوئے تھے عورت کے کفن پر خون کے کئی گہرے داغ تھے۔ یہ تمام کلائیو اور آسٹر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ہر طرف سے گیدڑوں کے رونے کی ہولناک آوازیں آ رہی تھیں اسی اثناء میں فضا میں کئی چگادڑیں اکٹھی ہو چکی تھیں۔ اب آسٹر اور کلائیو بھاگ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ مردے ان کے قریب آ کر بھیانک آواز میں قہقہے لگا رہے تھے۔ ذرا دور کالے لبادے والا آدمی کھڑا تھا اس کے ہاتھوں میں ٹینا کی خون میں لت پت برہنہ لاش تھی اسی وقت اسے سامنے سے ایک ہیولا آتا ہوا نظر آیا جیسے جیسے وہ ہیولا قریب آتا جا رہا تھا چگادڑیں خوف سے چیخنے ہوئی منتشر ہو رہی تھیں مردے بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ پادری تھا جو کلائیو اور آسٹر کے قریب پہنچ رہا تھا۔ خوفناک شکل کا کالے لبادے والا آدمی ٹینا کی لاش پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا۔ پادری کے قریب آتے ہی دونوں کی جان میں جان آئی۔ پادری نے انہیں تسلی دی۔ دونوں نے اپنے آنے کا مقصد بتایا کہ وہ ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جس میں پورے گاؤں کی بھلائی ہو۔ کلائیو نے تابوت کھولنے کی اجازت چاہی تو پادری نے منع کر دیا۔ کلائیو اور آسٹر نے پادری کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ان کے ساتھ مل کر گاؤں کو اس غفریت سے نجات دلائے۔ پادری نے ان کا ساتھ دینے کی حامی بھری اور کہا کہ اس بات کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہئے۔ بعد میں قبر پر مٹی چڑھا دی جائے گی۔ کلائیو قبر میں اتر کر تابوت کا ڈھکنا کھولنے لگا تو آسٹر کلائیو سے کہنے لگا۔

”کیا میں امید رکھوں کہ تم سونیا کی صورت دیکھ کر خوفزدہ نہیں ہو گے؟“

”سونیا تو کیا میں شیطان کی شکل دیکھ کر بھی خوف محسوس نہ کروں گا۔“

یہ کہتے ہوئے کلائیو نے ڈھکنا اٹھا دیا۔ دونوں سونیا کو دیکھ کر اچھل پڑے۔ سونیا کی آنکھیں بند تھیں لیکن شکل انتہائی خوفناک ہو چکی تھی۔ چہرہ غیر معمولی لمبا، سرخ زبان اور

کلائیو نے آسٹر کے کان میں سرگوشی کی۔ ”شاید وہی اس کی قاتل ہے۔“

”ہاں اس کا خون پیایا گیا ہے۔“

”کس نے ایسی حرکت کی ہے؟“

”سوائے سونیا کے اور کون کر سکتا ہے؟“

”وہ جس نے سونیا کا خون پیاتھا۔“

یہ سن کر کلائیو سوچ میں پڑ گیا اور قدرے توقف کے بعد سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ مکان سے باہر نکل گیا۔ رات کافی بیت گئی تھی اور کلائیو آگے آگے چل رہا تھا اور آسٹر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ گاؤں سے باہر نکل کر کلائیو نے کہا۔ ”ہمیں ہر حال میں گاؤں کو اس آفت سے نجات دلانا ہے خواہ اس کے لیے اپنی جان کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔“

”سب سے پہلے ہمیں سونیا کا خاتمہ کرنا ہے۔“

کلائیو یہ کہتے ہوئے قبرستان جانے والی پگھنڈی پر ہو لیا۔ ذرا دیر بعد وہ قبرستان پہنچے جہاں ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ زرد چاندنی میں فضا خوفناک لگ رہی تھی اسی وقت انہیں سر پر کسی بھاری پرندے کی اڑان محسوس ہوئی۔ دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا ایا بہت بڑی چگادڑ فضا میں چکر لگا رہی تھی جیسے وہ ان پر حملہ آور ہونا چاہتی ہو۔ اس کے ساتھ ہی گیدڑ کے چیخنے کی ہولناک آواز آئی اب تو فضا اور بھی ڈراؤنی ہو چکی تھی دونوں کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی مگر وہ گھبرانے والے نہیں تھے۔ وہ مختلف قبروں کے قریب سے گزرتے رہے۔ بعض قبروں پر پھول پڑے ہوئے تھے جب وہ سونیا کی قبر پر تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے اور ان کی جسم میں بخ بستہ لہر دوڑ گئی۔ کہ قبر پر سے تمام مٹی ہوئی تھی اور سامنے تابوت نظر آ رہا تھا۔ کلائیو تابوت کھولنے کے لئے تابوت پر جھپٹا اسی وقت چگادڑ کی چیخ سنائی دی۔ آسٹر نے سر اٹھا کر ایک دلدوز منظر دیکھا اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سامنے سے ایک طویل القامت آدمی سیاہ لبادہ اوڑھے ایک برہنہ عورت کی خون میں لت پت لاش اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ آدمی نے کالا لمبا کوٹ پہنا ہوا تھا پر اونچا ہیٹ تھا اس کے قریب آنے سے اس کی ہولناک شکل نظر آئی اس کی آنکھیں

ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے دو لمبے نوکیلے دانت انتہائی بھیاںک لگ رہے تھے۔ دانتوں پر خون لگا ہوا تھا۔

”اس کا غور سے مشاہدہ کرو۔“ کلائیو نے کہا۔ ”یہ چڑیل سو رہی ہے، یہ جان کا خون پی کر سوئی ہے۔ اگر اسے ہلاک نہ کیا گیا تو یہ ہر رات ایک انسان کا خون پئے گی۔“ آسٹرنے تابوت کے قریب بیٹھ کر بڑے غور سے دیکھا اس کا سینہ آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہوتے دیکھ کر آسٹربولا۔

”کلائیو یہ سانس لے رہی ہے، جلدی کرو کہیں جاگ نہ جائے۔“ کلائیو نے لکڑی کی ایک نوکدار سلاخ اس کے سینے پر رکھ کر پوری قوت سے سلاخ کے پچھلے سرے پر ہتھوڑا مارا۔ سلاخ سونیا کے دل میں اتر گئی۔ اس نے اسی لمحے آنکھیں کھول کر انتہائی دلدوز چیخ ماری اور اس کے ساتھ ہی تڑپ کر جان دے دی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے لاش کو غور سے دیکھتے رہے۔ شاید پھر وہ کوئی حرکت کرے۔ دیکھتے ہی دیکھتے خوفناک شکل انتہائی معصوم صورت میں بدل گئی۔ اب اس کے دانت بھی ٹھیک ہو گئے۔ اب وہ سونیا نظر آ رہی تھی۔ پرسکون ابدی نیند سوئی ہوئی معصوم سونیا۔ وہ گاؤں کی نیک ترین دوشیزاؤں میں سے ایک تھی سب اسے پیار کرتے تھے۔ کلائیو اور آسٹر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پادری نے دعائے مغفرت پڑھی اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا چل دیا۔ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ یکایک چیخ ابھری کلائیو اور آسٹر خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ چیخ دوبارہ سنائی دی تو کلائیو پہچان گیا۔ ”یہ تو پادری کی چیخ ہے۔“

وہ دونوں پادری کی طرف دوڑے۔ انہوں نے دیکھا پادری زمین پر پڑا تڑپ رہا ہے۔ پھر کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے دیکھا کہ اگلے لمبے والا پراسرار آدمی تیزی سے بھاگا جا رہا تھا رات کی پراسرار ہولناک تاریکی میں اس کا ہیولہ بہت بڑا نظر آ رہا تھا پھر وہ ایک قبر میں سما گیا۔ کلائیو اور آسٹرنے پادری کو اٹھایا اور گاؤں کی طرف چل دیئے۔ آدھی رات کو وہ پادری کو لے کر ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔

حالات انتہائی خطرناک ہو چکے تھے وہ اس عفریت کو ختم کرنے کا عہد کر چکے تھے۔

کلائیو اور آسٹر دوسری رات پھر قبرستان جانے کی تیاری کرنے لگے۔ احتیاط کے طور پر انہوں نے بندوق بھی اپنے ساتھ رکھ لی۔ جب وہ باہر نکلے تو رات کا پہلا پھر تھا۔ سڑک پر گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ مکانوں پر ویرانی برس رہی تھی۔ سب لوگوں کھڑکیاں دروازے بند کئے اپنے گھروں میں گہری نیند سو رہے تھے۔ دونوں قبرستان پہنچے اور جان کی فکر کے قریب ایک جھاڑی کے عقب میں چھپ کر کھڑے ہو گئے۔

دونوں نے سردی سے بچنے کے لیے گرم پتلون اور جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ ایک کے ہاتھ میں ایک آٹھ فٹ لمبی لکڑی کی نوکیلی سلاخ تھی جبکہ دوسرے کے ایک ہاتھ میں اعشاریہ چار کی دونالی بندوق اور دوسرے ہاتھ میں نارچ تھی۔ چاند بادل کی اوٹ سے نکلا اور چاند کی زرد روشنی درخت کے پتوں سے چھن کر جان کی قبر پر پڑی۔ دونوں قبر کو غور سے دیکھتے رہے کچھ دیر بعد قبر کی مٹی میں تھر تھراہٹ ہوئی اور مٹی کے چند ڈھیلے قبر کے بالائی حصے سے لڑھکتے ہوئے زمین پر آگرے پھر آہستہ آہستہ مٹی ایک طرف سرکنے لگی اور اچانک اس مٹی پر تابوت کا ڈھکنا اوپر اٹھا۔

”ہوشیار۔“ ایک نے دوسرے کو چوکنا کیا۔ اس کے چند لمحے بعد قبر میں سے ایک بھاری بھر کم جسم نکلا اور انہی کی طرف بڑھنے لگا۔ اسی لمحے چاند بادلوں کی اوٹ میں جا چھا۔ ہر طرف گہری تاریکی چھا گئی جس سے اس کا جسم ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن اس کا خوفناک چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ دو دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ ”جان بلاشبہ ڈریکولا بن چکا ہے۔“ یہ کہہ کر آسٹرنے مسلسل دو فائر اس کے ماتھے پر کئے۔ گولیاں ٹھیک نشانے پر لگیں لیکن اس پر اثر تک نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر آسٹر گھبرا گیا۔ موت سر پر منڈلا رہی تھی۔

”آسٹر نارچ کی روشنی اس پر ڈالو۔“ کلائیو چیخا۔ آسٹرنے فوراً نارچ روشن کر دی۔ اب جان کا پورا جسم صاف نظر آ رہا تھا اس کے ہاتھوں کے ناخن غیر معمولی لمبے اور نوکیلے تھے۔ وہ انتہائی خوفناک انداز میں آسٹر کی طرف بڑھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ آسٹر پر حملہ آور ہوتا کلائیو نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے آٹھ فٹ لمبی نوکیلی سلاخ اس کے سینے میں گھونپ دی۔ سلاخ سینے کے آر پار ہو گئی۔ جان درد سے تڑپ اٹھا

محسوس کی۔ آج اسے بار بار ناخن چبھ رہے تھے وہ حیران تھی کہ میک کے ناخن اچانک اس قدر کیسے بڑھ گئے جبکہ ہر اتوار کو وہ اپنے سامنے میک سے ناخن تراشنے کے لیے کہتی تھی۔

”میں کہتی ہوں پیچھے ہٹو میک تمہارے ناخن مجھے بار بار چبھ رہے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میک کو زور سے دھکا دیا لیکن میک ٹس سے مس نہ ہوا۔ روزی کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ آخر میک بولتا کیوں نہیں اور ساتھ ہی اس کے ناخنوں کے غیر معمولی لمبا ہونے پر تشویش ہوئی اس نے فوراً آنکھیں کھول کر میک کی طرف دیکھا۔ مارے خوف کے اس کی چیخ نکل گئی۔

اس قدر خوفناک مخلوق اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہاتھ پاؤں اور دھڑ انسانوں جیسا تھا لیکن سفید خوفناک چہرہ اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور آنکھوں کے گرد پیالہ نما حلقے تھے۔ زبان بھیڑیے کی طرح سرخ تھی اور آگے کے دو دانت کئی انچ لمبے اور نوکیلے تھے۔ روزی سڈول جسم کی تندرست و توانا لڑکی تھی۔ اس نے مدد کے لیے بہت چیخ و پکار کی لیکن اتفاق سے کوئی اس کی آواز نہ سنا۔ وہ قدرے پڑھی لکھی تھی اور ڈریکولا کے بارے میں کئی قصے کہانیاں پڑھ چکی تھیں۔ جن میں اس نے پڑھا تھا کہ وہ عورتوں کا خون پیتا تھا۔ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے سامنے عورتوں کے خون کا پیاسا ڈریکولا نمودار ہو سکتا ہے۔ جان اور سونیا کی موت اس کے خیال میں درندے کی چیرپھاڑ سے واقع ہوئی تھی لیکن آج اپنی آنکھوں سے ڈریکولا کو اپنے نرم و نازک بدن پر سوار دیکھ کر اسے یقین آیا کہ ڈریکولا ابھی زندہ ہے۔ ایک پل میں سینکڑوں خیالات اس کے ذہن میں ابھرے اور اس کے فوراً بعد اس نے اپنے آپ کو ڈریکولا کی گرفت سے چھڑانے کی بھڑپور کوشش کی لیکن تاریکی کے شیطان ڈریکولا نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ کر اس طرح بے بس کر دیا جیسے شکارچڑیا کو بے بس کر دیتا ہے۔ اس نے روزی کا بریزیر اور انڈرویزر نوچ ڈالا اور وہ بالکل غائب ہو گئی۔ روزی کا شفاف بدن دیکھ کر ڈریکولا کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ روزی درد سے تلملا اٹھی۔ پھول سی نازک روزی کے ساتھ اس قدر بربریت پہلے کبھی نہیں کی گئی

اور انتہائی خوفناک چیخ مار کر انتقام کے جوش میں آگے بڑھا لیکن سلاخ نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ تکلیف سے کراہتا رہا اور پھر بندھال ہو کر زمین پر گر گیا اور ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ اچانک چاند بادلوں کی اوٹ سے نکلا۔ وہ دونوں جان کی لاش کے قریب پہنچے لیکن اب وہاں جان کی لاش پڑی تھی جس کے سینے میں لمبی سلاخ پیوست تھی۔ دونوں نے مل کر جان کی لاش کے سینے سے سلاخ نکال کر اسے تابوت میں ڈال کر ڈھکنا بند کر کے اسے مٹی سے ڈھانپ دیا اور گاؤں کی طرف چل پڑے۔



روزی کی شادی کو ابھی چند ہی روز ہوئے تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے گھر میں ۳ گاؤں کے بیرونی جانب کھیت کے قریب واقع اپنے شوہر میک کے ساتھ ہنسی خوشی ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔ میک شہر میں واقع ایک کارخانے میں بطور مزدور ملازم تھا۔ ۱۲ رات میک دوسری شفٹ میں کام کرنے گیا تھا اسے گیارہ بجے گھر لوٹنا تھا۔ روزی بیڈروم کی کھڑکی کھول کر بستر پر لیٹی رات کو میک کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ میک کو دوسری شفٹ سے واپسی پر اکثر گھر کا دروازہ کھلا ملتا۔ اس رات بھی روزی بیڈروم میں اپنے بستر پر نیم عریاں حالت میں لیٹی ہوئی بے چینی سے میک کا انتظار کر رہی تھی۔ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی اور اس کے ساتھ ہی بتی گل ہو گئی۔ روزی۔ پلیٹ کر دیکھنے کی بھی زحمت نہ کی کیونکہ وہ سمجھی گئی تھی کہ میک آگیا ہے۔

”اوہ میک تم آگئے؟“ اور آنکھیں بند کر کے کروٹ بدل لی۔ چند لمحوں بعد۔ ایک کے سانسوں کا لمس محسوس ہوا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ میک زیادہ تر وقت گھر گزارے لیکن میک اس کی مرضی کے خلاف اوپر ٹائم بھی لگاتا تھا تاکہ اپنی بیوی کے زیادہ رقم کما سکے لیکن دوسری شفٹ میں وہ کبھی کبھار ایک ڈیڑھ گھنٹے کی چھٹی بھی لگاتا تھا۔

”اوہ میک تم اپنے ناخن تو کاٹ لیا کرو۔“ روزی کے سینے پر ناخن چبھا تو اس زبان سے بے اختیار نکلا۔ اس نے اپنے جسم سے میک کے بازوؤں کو ہٹاتے ہوئے لیکن میک زبان سے کچھ نہ بولا اور روزی نے اپنے جسم پر بازوؤں کی مضبوط گر



ڈریکولا کے سینے سے منہ لگا کر خون پینے لگی۔ چند ہی منٹ بعد وہ سیر ہو کر پیچھے ہوئی۔ کچھ اس انداز سے کھڑی ہو گئی جیسے اس کی عنایت کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ اس کے جواب میں ڈریکولا اس انداز سے مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس میں احسان کی کیا بات ہے یہ تو میرا فرض تھا کہ اپنی نسل کی مخلوق کی حفاظت کروں۔ اس کے بعد ڈریکولا نے ایک خالی تابوت کی طرف اشارہ کیا۔ ویپائر اس تابوت کے قریب پہنچی اور پلٹ کر ڈریکولا سے کہا۔ ”آقا..... میرے محترم آقا..... شب بخیر۔“

اس کے جواب میں ڈریکولا نے سر ہلایا اور اس کے فوراً بعد ویپائر نے اپنے تابوت میں لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور سو گئی۔ تہہ خانے میں کئی تابوت رکھے ہوئے تھے۔ ڈریکولا نے ان سب تابوتوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور ایک خالی تابوت میں لیٹ کر آرام کی نیند سو گیا۔ کچھ دیر بعد ایک اور ویپائر اسی چور راستے سے تہہ خانے میں داخل ہوئی اس نے تمام تابوتوں پر ڈھکنے رکھ دیئے اور ایک ٹن دبایا جس سے تمام تابوت لکڑی کے فرش کے اندر چلے گئے اور تابوتوں کے اوپر کی لکڑی کی سطح لکڑی کے فرش کے مساوی ہو گئی۔ اب صرف ایک تابوت فرش پر باقی رہ گیا۔ یہ ویپائر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اسی تابوت میں داخل ہو کر سو گئی۔



آدھی رات کو کلائیو اور آسٹر قبرستان پہنچے اور روزی کا تابوت کھول کر لاش کا معائنہ کیا۔ ابھی لاش کا چہرہ پوری طرح خوفناک نہیں ہوا تھا۔ دانت بھی باہر نہ نکلے تھے لیکن انگلیوں کے ناخن قدرے لمبے اور چہرہ کچھ خوفناک ہو گیا تھا۔ اس سے قبل کہ اس کے جسم میں ڈریکولا کے دانتوں کا زہر پوری طرح سرایت کرتا اور وہ ویپائر بن جاتی۔ کلائیو نے ایک سلاخ کو پوری قوت سے ہتھوڑا مارا۔ سلاخ لاش کے دل میں اتر گئی۔ لیکن اس نے خلاف توقع کوئی چیخ نہ ماری لیکن آنکھیں کھول دیں اور اس کے چہرے کے اتر چڑھاؤ سے یہ اندازہ ہوا کہ اس نے تکلیف محسوس کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک ہلکی سی درد بھری آہ بھر کر مر گئی اور اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ کلائیو نے لاش کی انگلیوں کی طرف اشارہ کیا تو آسٹر نے انگلیوں پر نظر ڈالی۔ اس کے لمبے ناخن غائب

تھی۔ وہ ہڈی ہال ہو کر بے ہوش ہو گئی۔

ڈریکولا جی بھر کر دل بہلانے کے بعد دیوانہ وار روزی کے جسم پر اپنے دو لمبے نوکیلے دانتوں سے کاٹنے لگا۔ روزی کے جسم کے مختلف حصوں، گردن، رخساروں اور شانوں سے خون بننے لگا۔ جسے ڈریکولا لپالپ بھوکے شیر کی مانند اپنی سرخ زبان اور ہونٹوں سے چاٹنے لگا۔ پیاس بھیجی تو ڈریکولا روزی کے مکان سے نکل کر جنگل کی طرف چل دیا۔ اچانک کلائیو اور آسٹر نے جو شہر سے واپس آ رہے تھے ڈریکولا کو روزی کے مکان سے نکلتے دیکھ لیا وہ ایک درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈریکولا ذرا آگے بڑھا تو یہ دونوں فوراً ہی ڈریکولا کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ وہ سر تپا سیاہ لبادہ اوڑھے بڑے پروقار انداز میں جانے پہچانے اندھیرے راستوں پر اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کھیت عبور کر کے وہ گھنے تاریک خوفناک جنگل سے گزرنے لگا۔ جنگل سے گزر کر وہ آسیب زدہ عفریت محل کے صدر دروازے پر پہنچا اور آہنی دروازے کھول کر راہداری میں داخل ہوا اور مختلف دروازے کھولتا ہوا کئی کمروں سے گزر کر ایک تہہ خانے کے قریب پہنچ کر رک گیا اور پلٹ کر دیکھا کہ کوئی اسے کہیں دیکھ تو نہیں رہا لیکن اسے دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔ چند لمحے سب طرف دیکھ کر اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی خفیہ کھڑکی کے راستے تہہ خانے میں داخل ہوا۔ جہاں اس کی نظر ایک ویپائر پر پڑی جو سفید کفن میں اپنے ہاتھ پھیلائے مسکراتی ہوئی اس کی جانب بڑھی۔

”میں کئی دن سے پیاسی ہوں۔ مجھے کئی دن سے تم نے باہر جانے کی اجازت نہیں دی۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں باہر جا کر شکار تلاش کروں۔“ یہ کہہ کر خوفناک چہرے والی ویپائر اپنے آقا ڈریکولا سے پلٹ گئی۔

”نہیں! باہر خطرہ ہے۔ اگر تم زیادہ ہی پیاس محسوس کر رہی ہو تو میں ابھی ایک حسینہ کا خون پی کر آیا ہوں۔ اس میں سے آدھا تم پی لو۔ آؤ میری جان میرے قریب آؤ!“

یہ کہہ کر ڈریکولا نے اپنا گریبان چاک کر کے اپنے عیاں سینے پر اپنے تیز ناخن گاڑ دیئے۔ ڈریکولا کے سینے سے خون رسنے لگا۔ ویپائر نے احترام میں اپنی نظریں جھکا لیں اور

بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے لیکن کلائیو اور آسٹر کچھ زیادہ ہی جستی کا مظاہرہ کر کے آہنی سلاخوں سے اپنا دفاع کر رہے تھے۔ ایک کتے نے چھلانگ لگا کر آسٹر کے کندھے کو زخمی کرنے کی کوشش کی لیکن آسٹر نے بجلی کی سی سرعت سے پیچھے ہٹ کر سلاخ اس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ سلاخ پیٹ کے پار ہو گئی۔ کتا تکلیف سے بلبلاتا اس کی چیخوں سے ماحول اور زیادہ بھیانک ہو گیا۔ آسٹر کتے کے پیٹ سے سلاخ نکالنے لگا تو دوسرے کتے نے موقع پا کر آسٹر کی کمر پر جست لگائی۔

اس پر باقی دو کتے بھی آسٹر کو بے بس و مجبور سمجھ کر اس پر حملہ آور ہوئے یہ صورت حال دیکھ کر کلائیو تیزی سے آسٹر کی طرف پلٹا اور آسٹر کی کمر پر چڑھے ہوئے کتے کے پیٹ میں سلاخ گھونپ دی۔ اسی دم کتے نے تڑپ کر جان دے دی۔ کلائیو نے ایک جھٹکے کے ساتھ سلاخ واپس کھینچ لی اور تیسرے کتے پر حملہ آور ہوا۔ اب میدان میں صرف دو کتے باقی رہ گئے تھے جو کبھی اپنے ساتھیوں کی لاشوں کو زمین پر پڑا ہوا دیکھ کر منہ بناتے جیسے افسوس کر رہے ہوں اور کبھی ان دونوں پر حملہ آور ہوتے اور انہیں چیرنے پھاڑنے کی بھرپور کوشش کرتے لیکن کچھ ہی دیر بعد کلائیو اور آسٹر کی پھرتی اور بہادری کے سبب وہ دونوں بھی زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ کلائیو اور آسٹر کے جسم پر چند معمولی خراشیں اور چھوٹے موٹے زخم آگئے تھے لیکن وہ اس کی قطعی پرواہ کئے بغیر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے اور آگے بڑھے۔ ابھی وہ چند ہی قدم چلے تھے کہ چھت سے بڑی بڑی چنگاڑیں پھڑپھڑاتی ہوئی آئیں اور ان کے سر کے اوپر چکر کاٹنے لگیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ انتہائی تیزی سے ان پر حملہ آور ہوئیں۔ ان دونوں کے ہاتھوں سے سلاخیں جھوٹ کر زمین پر گر گئیں لیکن اس کے فوراً بعد ان دونوں کے ہاتھوں میں دو دھاری تیز خنجر چمک رہے تھے کلائیو نے اپنے چہرے پر حملہ کرنے والی دو بڑی بڑی چنگاڑوں کے سینے میں خنجر گھونپ کر انہیں ہلاک کر ڈالا۔ دونوں چنگاڑیں انتہائی مکرہ آوازیں نکالتی ہوئیں فرش پر گر گئیں اور مایہ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ چنگاڑوں نے بار بار خوفناک انداز میں اپنی چونچوں اور تیز پنجوں سے پے در پے حملے کر کے ان کے ہرے لمولہان کر دیئے آسٹر نے بھی اس دوران کئی چنگاڑیں اپنے خنجر کا نشانہ بنائیں۔

ہو چکے تھے اور چہرہ پہلے کی طرح خوبصورت ہو چکا تھا۔ وہ دونوں تابوت کا ڈھکن بند کر کے تابوت کو مٹی سے ڈھانپ کر جنگل کی طرف چل پڑے۔ جنگل میں پہنچ کر انہوں نے ایک جھاڑی میں سے چھ فٹ لمبی لوہے کی دو نوکیلی سلاخیں نکالیں اور ایک ایک سلاخ لے کر وہ عفریت محل کی طرف جانے کے لیے آگے بڑھے۔ رات کے تین بج رہے تھے جنگل میں نیم تاریکی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چاند کی روشنی درخت کے پتوں سے چھن چھن کر زمین پر پڑ رہی تھی چاند کی ہلکی سی روشنی میں دور کی چیز صاف نظر نہ آتی تھی۔ وہ دونوں خوف سے بے نیاز اپنے گاؤں کو خونی بلاؤں اور شیطانی روحوں سے پاک کرنے کا عزم لئے ہوئے سلاخیں کندھوں پر رکھے شانہ بٹانہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر اپنے سامنے کچھ فاصلے پر ایک متحرک سائے پر پڑی۔

”دیکھو وہ کون ہے؟“ آسٹر نے چونک کر پوچھا۔ ”کوئی بدروح تو نہیں؟“

”ایسے خوفناک جنگل میں عفریت محل کے قریب رات کے تین بجے بالکل تنہا شیطانی روح کے سوا اور ہو بھی کون سکتا ہے؟“

کلائیو نے اپنی رائے ظاہر کی۔ ”پہلے اس کا پیچھا کرو“ اسی کا خاتمہ کر ڈالیں۔“

وہ دونوں بڑی تیزی سے سائے کی طرف بڑھے۔ وہ جوں جوں تیزی سے آ بڑھتے سایہ بھی توں توں آگے بڑھتا جاتا۔ تمام ترکوشش کے باوجود سائے تک یا دوسرے لفظوں میں اس پر اسرار شے تک پہنچنے میں ناکام رہے حتیٰ کہ جنگل ختم ہو گیا اور عفریت محل کی طرف لپکا اور پھر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ دونوں شیطانی روحوں کے مسکن عفریت محل کے صدر دروازے پر پہنچے۔ رنگ کی یہ بلند عمارت بڑی خوفناک لگ رہی تھی۔ کلائیو اور آسٹر نے دروازے داخل ہونے سے پہلے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے ”گڈ لک ٹویو“ کہا۔

جوں ہی انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی آہنی دروازے کی گڑگڑاہٹ فضا گونج اٹھی اور اس کے ساتھ ہی چار انتہائی خوفناک سیاہ کتے کسی طرف سے نہ ہوئے اور ان پر حملہ آور ہوئے۔ ان کتوں کے دو دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ ان دونوں کو پھاڑ ڈالنے کے لیے بے تاب تھے اور بار بار انتہائی خطرناک طریقے سے

آنکھیں کھولتی ہوئی تابوت میں سے اٹھ بیٹھی اور ہڑپ کر جانے والی نگاہوں سے کلائیو کو دیکھ کر دیوار پر لگے ہوئے ایک ٹن کو بادیہ۔ ٹن دبتے ہی ایک زوردار دھماکے کے ساتھ لکڑی کے فرش کے اندر سے دس بارہ تابوت نمودار ہوئے۔ ان کے ڈھکنے خود بخود فرش پر لڑھک گئے۔ ہر ایک تابوت سے ایک ویپار اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان سب کے دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ باریک لباس میں سے ان کے جوان جسم جھلک رہے تھے۔ تابوت سے نکلنے والی دس گیارہ ویپاروں نے کلائیو اور آسٹر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہ دہشتناک منظر دیکھ کر پہلی بار کلائیو اور آسٹر کو خوف محسوس ہوا۔ وہ پشت سے پشت لگا کر آہنی سلاخیں سمجھال کر کھڑے ہو گئے۔ موت سر پر منڈلا رہی تھی لیکن وہ آخر دم تک اپنا دفاع کرنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

اسی وقت ایک تابوت میں سے ایک گرجدار آواز سنائی دی۔ تمام ویپاروں کی نظر اس تابوت کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ یہ تابوت دوسرے تمام تابوتوں سے بڑا تھا۔ سب سے پہلے تابوت کے کنارے پر بڑے بڑے ناخنوں والا ایک ہاتھ نمودار ہوا پھر دھکتے انگاروں جیسی بڑی بڑی آنکھوں والا ڈریکولا تابوت میں سے اٹھ بیٹھا اور گردن موڑ کر اپنے دو دشمنوں پر نظر ڈالتے ہوئے تابوت سے نکل کر چند قدم آگے بڑھا وہ ایک طویل لقامت شخص تھا اور اس نے سیاہ لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ سب ویپاریں اس کے احترام میں سر جھکا کر کھڑی ہو گئیں جیسے اس کے حکم کا انتظار کر رہی ہوں۔ ڈریکولا نے ہاتھ کے اشارے سے حملے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام ویپاروں نے خوفناک آوازیں نکالتے دئے اپنے درمیان قدرے اندھیرے میں کھڑے ہوئے دشمنوں پر حملہ کر دیا۔ وہ اپنے بڑا ناخنوں اور نوکیلے لمبے دانتوں سے ان پر حملہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھیں۔ کلائیو نے اپنی جانب بڑھتی ہوئی ایک ویپار کے سینے میں سلاخ گھونپ دی۔ ویپار کی دردناک ٹان سے تہہ خانہ گونج اٹھا۔ وہ زخم کی تاب نہ لا کر بے دم ہو کر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ کلائیو نے پوری قوت سے سلاخ کو واپس کھینچنا چاہا لیکن سلاخ اس کے سینے سے نکل نہ سکی اور قلع پاتے ہی دوسری ویپاروں نے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ سلاخ کا خیال چھوڑ کر پیچھے ہٹا رنجھر نکال کر فضا میں لہراتا ہوا ان پر حملہ آور ہوا اور ایک ویپار کے سینے میں خنجر

آخر کار سب چنگاڑیں ڈھیر ہو گئیں اور انہوں نے سکون کا سانس لیا اور اس کمرے کی تلاش شروع کر دی جس میں تہہ خانے میں جانے کا چور راستہ تھا۔ وہ عفریت محل کی بھول پھیلوں میں گم ہو گئے۔ وہ اس مخصوص کمرے کی بازیابی کے لیے پوری کوشش کر رہے تھے انہوں نے عفریت محل کا کونہ کونہ چھان مارا۔ جب وہ راہداری میں آنکے تو انہیں پتہ چلا کہ دن نکل آیا ہے۔ راہداری میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک بار پھر تلاش شروع کر دی اس بار انہیں کامیابی ہوئی ان کی نظر ایک ایسے تاریک کمرے میں پڑی جہاں سے تہہ خانے میں داخل ہونے کے لیے خفیہ راستہ جاتا تھا جیسے ہی وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے پراسرار انداز میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ سیٹیوں کی آواز آسٹر اور کلائیو کے کانوں میں تیر کی طرح چھ رہی تھیں پھر بہت سی عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان عورتوں کی آواز سے چھت نیچے گر جائے گی۔ دونوں اس صورت حال سے کچھ گھبرائے پھر حوصلہ پیدا کر کے آگے بڑھے ابھی وہ تہہ خانے کے زینے پر پہنچے تھے کہ بھیڑیوں کے غرانے اور چنگاڑوں کی چیخیں سنائی دی۔ وہ دونوں سمجھ گئے۔ تاریکی میں بدروحوں کی حکومت ہوتی ہے۔ تاریکی میں ان سے مقابلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پکڑ کر تہہ خانے میں اتر گئے۔ تہہ خانے میں ہر طرف ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ فضا بڑی خوفناک تھی۔ لمبے لمبے ستون چھت کو سہارا دیئے کھڑے تھے۔ سامنے ایک اونچا سا شیخ تھا قریب ہی ایک کھلا تابوت پڑا تھا۔

وہ دونوں اس کے قریب پہنچے۔ تابوت میں ایک ویپار سو رہی تھی۔ ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے دو دانت اور اس کا لبو ترہ خونی چہرہ بڑا خوفناک لگ رہا تھا۔ ان دونوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن انہیں اور کوئی تابوت نظر نہیں آیا۔

”حیرت ہے باقی تابوت کہاں گئے؟“ آسٹر نے تعجب و پریشانی کے عالم میں کہا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ بہر حال پہلے اس جڑیل کا خاتمہ کر ڈالیں پھر ان تابوتوں کو بھی تلاش کریں گے۔ وہ بھی یہیں کہیں ہوں گے۔“ یہ کہہ کر کلائیو چھ فٹ لمبہ نوکیلی آہنی سلاخ اس ویپار کے سینے میں گھونپنا چاہتا تھا کہ ویپار ایک دلدوز چیخ مار کر

فادر جوزف نے وقت ضائع کئے بغیر تیسری مشعل جلائی اور خود بھی بڑی پھرتی سے دیپاروں پر حملہ آور ہوا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ڈریکولا آگ سے خوفزدہ ہو کر جان بچانے کے لیے چور راستے سے ہوتا ہوا کمرے میں پہنچ گیا۔ دیپاروں کو بھی یہی ترکیب پسند آئی کہ فرار ہو کر جان بچائی جائے۔ وہ بھی ایک ایک کر کے چور راستے سے گزر کر کمرے میں پہنچ گئیں اور اب تمہ خانے میں صرف یہ تینوں مشعل بردار افراد رہ گئے۔ ”ان کا بچھا کرو اور ان کو کمرے سے نکال کر راہداری میں دھکیل دو۔“ یہ کہہ کر فادر جوزف سب سے پہلے چور راستے سے اس کمرے میں پہنچا جہاں شیطانی روحمیں جمع تھیں۔ کلائیو در آسٹر بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے اور کمرے میں پہنچ کر تینوں نے حملہ کر کے تمام یطانی روحوں کو ڈریکولا کے کمرے سے نکال کر راہداری میں دھکیل دیا جہاں دھوپ کی ہزکروں سے ڈریکولا اور دیگر تمام شیطانی روحوں کا سانس اکھڑنے لگا۔ وہ اندھیرے کی اش میں ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔ انہوں نے تاریک کمرے میں داخل ہونے کی بہت دوش کی لیکن جب بھی کوئی شیطانی روح کسی کمرے کی طرف بڑھتی کوئی ایک مشعل دار آگ برساتی ہوئی مشعل سے اس پر حملہ آور ہوتا اور وہ ڈر کر پیچھے ہٹ جاتی۔ علوں کی تیز روشنی اور حرارت اور دھوپ سے ڈریکولا اور تمام شیطانی روحمیں ندھال کر راہداری میں گر پڑیں اور درد سے کراہنے اور چیخنے لگیں۔ کلائیو دوڑ کر تمہ خانے میں پہنچا اور دونوں آہنی سلاخیں اٹھا لیا۔ اس نے ایک سلاخ آسٹر کے ہاتھ میں تھماتے سے ایک بے ہوش پڑی دیپار کے سینے میں گھونپ دی۔ دیپار نے ایک فلک شکاف مار کر دم توڑ دیا۔ اب وہ دوسری دیپار پر حملہ آور ہوا۔ آسٹر نے سب سے پہلے یکولا کے سینے میں آہنی سلاخ گھونپ دی۔ ڈریکولا نے اس قدر خوفناک چیخ ماری کہ رت محل کے در و دیوار کانپ اٹھے۔ وہ کافی دیر تک درد سے تڑپتا رہا اور پھر وہ مبارک رُئی آئی جب اس کا دم نکل گیا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

اب کلائیو اور آسٹر نے باقی دیپاروں کے سینے میں بھی باری باری سلاخیں گھونپ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کامیابی پر سب کے چروں پر خوشی اور اطمینان تاثرات پھیل گئے۔ تمام شیطانی روحوں کے خاتمے کے بعد عفریت محل میں سکون ہو

گھونپ دیا لیکن دیپار نے اس کا کوئی خاص اثر نہ لیا اور بار بار کلائیو پر اپنے نوکیلی ناخنوں سے حملہ کرتی رہی۔ آسٹر بھی صرف دو دیپاروں کو ٹھکانے لگا سکا۔ اس کے بعد اس کی سلاخ ایک دیپار کے سینے میں ایسی پوسٹ ہوئی کہ باہر نہ نکل سکی اور وہ بھی خنجر سے اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہو گیا۔

خونی دیپاروں کی خواہش تھی کہ انہیں زخمی کر کے ان کے جسم میں دانت گاڑ کر ان کا خون پی لیں تاکہ ان کی نسل میں اضافہ ہو سکا۔ اچانک تمہ خانے کی دو چھت میں ایک مشعل جل اٹھی اور تمہ خانہ روشن ہو گیا۔ مشعل میں سے چنگاریاں اور شعلے نکل رہے تھے۔ دیپاروں نے خوف سے آگ اگلتی ہوئی مشعل اور مشعل بردار کو دیکھا۔ مشعل بردار چھت سے تمہ خانے میں کود گیا۔ دیپاریں خوف سے پیچھے ہٹ گئیں۔ انہوں نے مشعل بردار کو پیچھے ہٹتے ہوئے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا وہ بھی ایک انسان جو عام حالات میں ان کا شکار بن سکتا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں مشعل دیپاروں کے کسی آفت سے کم نہ تھی۔ وہ اپنی جان بچا کر دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگیں۔ ڈریکولا چہرے پر بھی خوف اور غصے کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بھی مشعل سے شعلے اور چنگاریاں نکلتی دیکھ کر اپنے دفاع کے لیے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

کلائیو اور آسٹر نے اسے نیبی مد تصور کرتے ہوئے مشعل بردار کو دیکھا۔ دونوں نے اسے پہچان لیا۔ مشعل بردار گاؤں کے گرجے کا پادری فادر جوزف تھا۔

”ادہ فادر جوزف۔“ ان کی زبان سے بیک وقت بے اختیار نکلا۔ فادر جوزف جلتی ہوئی مشعل کلائیو کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ ”لو کلائیو۔ ہو شیار۔ اس مشعل۔ ان شیطانی روحوں کو بھون ڈالو۔“ کلائیو نے چھلانگ لگا کر مشعل پکڑ لی اور آسٹر کو پشت کی جانب کرتے ہوئے دیپاروں پر حملہ آور ہوا۔ تمام شیطانی روحمیں آگ سے حد خوفزدہ تھیں۔ دیپاروں کے پاس اب اپنے دفاع کے لیے پیچھے ہٹنے کے سوا کوئی چا نہ تھا۔ فادر جوزف نے لائٹر سے دوسری مشعل روشن کی۔ دوسری مشعل بھی انتہائی شعلے اگلنے لگی۔ فادر نے یہ مشعل آسٹر کی طرف اچھال دی۔ اب آسٹر بھی آگے بڑھ کر مشعل سے ڈریکولا اور دیپاروں پر حملے کرنے لگا۔

## سریاموٹر کی ڈائن

گیا۔  
گاؤں کے لوگ ان تینوں افراد کو رات بھر گاؤں سے غائب پا کر فکر مند ہوئے اور  
دس بارہ کڑیل جوان ہاتھوں میں نیزے، لٹھیاں اور چھریاں لئے ہوئے انہیں تلاش کرنا  
کرتے عفریت محل کے صدر دروازے سے اندر داخل ہو کر راہداری میں پہنچے تو  
عجیب منظر دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ ان تینوں کی کامیابی پر بے حد خوش ہوئے لیکن انہیں  
جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ وہ تینوں شیطانی روحوں سے مقابلے کے دوران سخت نڈھال  
اور زخمی ہو چکے ہیں۔ لہذا جلد ہی چند جوانوں نے تینوں کو طبی امداد بہم پہنچائی اور انہیں  
گاؤں لے گئے جبکہ دوسرے جوانوں نے ڈریکولا اور ویپاروں کی لاشوں کو ٹھکانے لگا  
کا کام انجام دیا اور نئی نوع انسان کو ڈریکولا کی نحوست سے نجات حاصل ہو گئی۔

○☆○

نوجوان سب انسپکٹر دلیپ گنگولی بی۔ اے کرنے کے بعد براہ راست سب انسپکٹر  
بھرتی ہوا تھا اور دو سال کی ٹریننگ کے بعد اس کا تقرر چکروہ پولیس اسٹیشن میں ہوا تھا۔  
دلیپ کا قد چھ فٹ دو انچ تھا۔ رنگ گورا، کالی آنکھیں اور چوڑی چکلی چھاتی تھی۔ وہ اس  
قدر ہینڈسم تھا کہ اگر اسے فلم میں چانس مل جاتا تو اچھے اچھے فلم اسٹارز کے چراغ گل کر  
دیتا بلکہ کالج میں اس کے ساتھی ہمیشہ اسے بمبئی جانے کا مشورہ دیتے تھے۔ لیکن دلیپ  
پولیس یا ملٹری میں سروس چاہتا تھا۔

چکروہ پولیس اسٹیشن میں آئے اسے بیس دن ہی گزرے تھے۔ ایک دن وہ اپنے  
افسر انسپکٹر جوگپال کے ساتھ ایک قتل کیس پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا کہ پولیس اسٹیشن کے

”گیارہویں ایکسیڈنٹ۔“ دلپ نے حیرت سے کہا۔ ”میں سمجھا نہیں سر۔“  
انسپکٹر نے جواب دیا۔ ”سریا موڑ اس علاقے کا سب سے زیادہ خطرناک موڑ ہے۔  
سڑک نے اس جگہ سانپ کی طرح دو ایسے بل لئے ہیں کہ ذرا سی غلطی سے گاڑی کھڈ  
میں گر سکتی ہے۔ اسی لئے اس کو ”سریا موڑ“ کہا جاتا ہے۔ سرپ یہاں کے لوگ سانپ کو  
کہتے ہیں۔“  
”تو کیا ان موڑوں پر خطرہ کی وارننگ کے بورڈ نہیں لگے ہیں۔“ دلپ نے سوال  
کیا۔

”بورڈ لگے ہیں۔ آدھ میل پہلے سے وارننگ کے بورڈ شروع ہو جاتے ہیں۔  
شروع میں خیال کیا جاتا تھا کہ یہ ایکسیڈنٹ ڈرائیور کی لاپرواہی سے ہوتے ہیں۔ لیکن  
اتفاق سے چوتھے حادثے میں ڈرائیور مرنے سے پہلے اپنا بیان دینے کے قابل تھا۔ اس کے  
بیان سے پہلی بار شک ہوا کہ حادثوں کی وجہ کچھ اور ہے۔“  
”وہ کیا وجہ تھی؟“ دلپ نے سوال کیا۔

انسپکٹر جوگپال نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”شروع میں اس  
نقص کے بیان پر بھی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ اس وقت کے پولیس اسٹیشن انچارج کا خیال  
نہ تھا کہ مرنے والا اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اس لیے ایسا ناقابل یقین بیان دیا گیا  
نہ۔“ اچانک انسپکٹر نے دلپ کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ ”کل چاند کی کیا تاریخ تھی؟“  
”مجھے تو معلوم نہیں۔“ دلپ نے جواب دیا۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک سپن نے کہا۔ ”دوچ تھی سر۔“  
”یہ دوسری عجیب بات ہے۔“ انسپکٹر جوگپال بولا۔ ”ہر ایکسیڈنٹ دوچ کی رات  
کو ہی ہوتا ہے۔“

”پلیز سر۔ میری سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا۔“ دلپ بولا۔ ”دوچ کو ہی  
ایکسیڈنٹ کیوں ہوتے ہیں اور اس مرنے والے نے کیا بیان دیا تھا جسے ناقابل یقین سمجھا  
گیا۔“

انسپکٹر جوگپال نے اس بار ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”کیا تم بھوت پریت کے

احاطے میں ایک ٹرک کے انجن کی بھاری آواز سنائی دی۔ دو منٹ بعد ہی قدموں کی چاپ  
سنائی دی پھر ایک بھاری مردانہ آواز آئی۔  
”میں انسپکٹر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔“  
”اندر ہیں۔ چلو جاؤ۔“ باہر بیٹھے ڈیوٹی آفیسر نے کہا۔  
دروازہ کھلا۔ ایک سردار جی اندر داخل ہوئے اور سلام کر کے انسپکٹر جوگپال سے  
بولے۔

”انسپکٹر صاحب۔“ ”سریا موڑ“ پر ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ایک کار نیچے کھڈ میں  
پڑی ہے۔“  
”اوہ گاڑ۔“ یہ سن کر انسپکٹر جوگپال کے منہ سے نکلا۔ ”پھر ہو گیا۔ اوکے سردار جی  
تحقیق یو۔ ہم ابھی جا کر دیکھتے ہیں۔“

سردار جی نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ”لوگ تو اب اسے ”بھوتیا موڑ“  
کہنے لگے ہیں انسپکٹر صاحب۔ لگتا ہے سچ مچ وہاں کوئی بھوتی رہنے لگی ہے۔“  
”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ انسپکٹر نے جواب دیا۔ ”اچھا بادشاہو، ہم چلتے ہیں  
ست سری اکال۔“ یہ کہہ کر سردار جی باہر چلے گئے۔ سردار جی کے جانے کے بعد سب  
انسپکٹر دلپ گنگولی نے حیرت سے کہا۔

”آپ نے ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر کہا ”پھر ہو گیا۔“ اور پھر سردار جی کا یہ کہنا کہ  
لوگ اب سریا موڑ کو ”بھوتیا موڑ“ کہنے لگے ہیں۔ میں کچھ سمجھا نہیں سر۔“  
انسپکٹر جوگپال نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ راستے میں، میں سب کچھ  
سمجھا دوں گا۔“

انسپکٹر گنگولی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر آکر انسپکٹر نے دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور جیب  
میں بیٹھ کر چل دیا۔ گاڑی انسپکٹر جوگپال خود چلا رہا تھا۔ آبادی سے نکل کر جب ان  
گاڑی سنان پھاڑی سڑک پر آگئی تو دلپ بولا۔ ”آپ مجھے کچھ بتا رہے تھے۔“  
”یہ گیارہواں ایکسیڈنٹ ہے۔“ انسپکٹر جوگپال نے سڑک پر نظریں جمائے جمائے۔  
جواب دیا۔



قابل ہوا انپکٹر گنگولی؟“

”نوسر۔“ دلپ نے جواب دیا۔ ”یہ سائنس کا زمانہ ہے۔ انسان چاند تک پہنچ چکا ہے۔ بھوت پریت کے قصے زمانہ جہالت کی دین ہیں۔“

”سائنس چاہے جتنی ترقی کر لے۔“ انپکٹر جو گپال بولا۔ ”لیکن اب بھی کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کو لاجب یا سائنس کی مدد سے نہیں سلجھایا جاسکتا۔ سربا موڑ کے چوتھے ایکسیڈنٹ میں مرنے والے شخص نے، جانتے ہو کیا بیان دیا تھا؟“

”کیا بیان دیا تھا؟“ دلپ نے سوال کیا۔

”وہ رانی کھیت کے ایک دراز قد شخص کا بیٹا تھا۔ چکروٹہ سے رانی کھیت جا رہا تھا۔ وہ بھی دوج کی رات تھی۔ موسم بالکل صاف تھا۔ سڑک بالکل سنان تھی۔ کبھی کبھی کوئی بس یا کار گزر جاتی تھی۔ اپنے بیان کے مطابق سربا موڑ کے قریب پہنچ کر اس نے کار کی رفتار کم کر دی اور جب وہ سربا موڑ سے مشکل سے سو گز کے فاصلے پر رہ گیا تو اچانک اس کی کار کی لائنیں ایک انسانی جسم پر پڑیں۔ سڑک کے پیچوں پیچ کوئی کھڑا اس کو روکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ کار کے ڈرائیور نے کار کی رفتار اور کم کر دی اور اس شخص کے قریب لا کر کار کو بریک لگا دیئے۔ قریب آنے پر اس نے دیکھا کہ کار کو روکنے کا اشارہ کرنے والی ایک عورت تھی۔ نہیں عورت بھی نہیں بلکہ ایک بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ شخص حیران رہ گیا کہ رات کو اس وقت ایک اکیلی خوبصورت لڑکی اس سنان پہاڑی راستہ پر کب کر رہی ہے۔ لڑکی نے قیمتی ساڑھی پن رکھی تھی۔ زیور بھی تھے مگر اس کی ساڑھی بے جگہ جگہ دھول اور مٹی لگی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا، جس سے خول ٹپک رہا تھا۔ اس شخص نے سوچا شاید کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اس نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”میری کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ نیچے کھڈ میں گر پڑا ہے۔ اتفاق سے میں بچ گئی ہوں۔ اگر آپ مجھے اگلے گاؤں تک چھوڑ دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔ اس گاؤں میں میرے ایک رشتہ دار رہتے ہیں۔“

”اگلا گاؤں سربا موڑ سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔“ اس شخص نے فوراً کار کا دروازہ کھول کر کہا۔ ”اندر آ جائیے۔“

وہ لڑکی اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اس شخص نے کار اشارت کی تو لڑکی نے کہا۔ ”جناب، کیا آپ بھوت پریت کو مانتے ہیں؟“

”شرمیتی جی!“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”یہ ماڈرن زمانہ ہے۔ بھوت پریت پرانے لوگوں کا وہم تھا۔ اس زمانے میں بھوت پریت نہیں ہوتے۔“

اس وقت تک کار سربا موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ اس لڑکی نے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ بھوت پریت اس زمانے میں نہیں ہوتے تو ذرا ادھر میرے ہاتھوں کی طرف دیکھئے۔“

اس شخص کا بیان ہے کہ اس لڑکی کے ہاتھ دیکھتے ہی خوف سے اس کی جان نکل گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں بے قابو ہو گئے۔ اسے ایسا لگا جیسے اس پر فالج گر پڑا ہو۔ اس کے جسم نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ گاڑی موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ وہ اسٹیرنگ گھمانے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ نتیجہ میں کار تنگ سڑک کے جنگلہ سے ٹکرائی اور جنگلہ کو توڑ کر نیچے کھڈ میں گر پڑی۔“

”باپ رہے۔“ دلپ کے منہ سے نکلا۔ ”اس نے لڑکی کے ہاتھوں میں ایسی کیا چیز دیکھی تھی جس سے وہ ڈر گیا۔“

”اس آدمی کی گردن پر دس ایسے نشان تھے جیسے تیز دھار کی چیزیں چھائی ہوں۔ اس کا بیان تھا کہ لڑکی بے حد خوبصورت تھی لیکن اس کے ہاتھ انسانی نہیں تھے۔ جب اس نے لڑکی کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو اچانک اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے ٹن بڑھنے شروع ہو گئے۔ اس کے ہاتھ اپنی جگہ رہے لیکن ناخن لمبے ہوتے گئے اور رتے ہوتے اس کی گردن تک پہنچ گئے۔ بس اسے اتنا ہی یاد تھا۔ اس کے بعد کار کھڈ میں گر پڑی تھی۔“

”اوہ نو!“ دلپ گنگولی چلایا۔ ”اٹ از امپاسل۔“ یہ قطعی ناممکن ہے۔ انسانی تھوں کے ناخن اس طرح کبھی نہیں بڑھ سکتے۔ اور پھر اگر وہ لڑکی حادثہ کے وقت کار میں

تھی تو اس کی لاش بھی ملنی چاہئے تھی۔“

انسپکٹر جو گپال نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ”اسی لئے تو اس وقت کے پولیس انسپکٹر نے مرنے والے کے بیان پر یقین نہیں کیا تھا اور سمجھا تھا کہ موت کے خوف نے اس کے سوچنے سمجھنے کی قوت ختم کر دی تھی۔ اس نے شاید کبھی بھوت پریت کا قصہ پڑھایا نہ ہو گا۔ وہی اس کے ذہن میں رہ گیا تھا جو اس نے لاشعوری کیفیت میں بیان کر دیا۔ چنانچہ انسپکٹر نے اس شخص کے مرنے کے بعد فائل میں اتفاقی حادثہ لکھ کر فائل بند کر دی۔“

”اس سے پہلے کے حادثوں میں گردن کے نشانات پر توجہ نہیں دی جاتی تھی کیونکہ اتنی اونچائی سے کار کھڑ میں گرنے پر جسم پر دسیوں زخموں کے نشانات بن جاتے تھے۔“

”اس حادثہ کے بعد دو باتیں عجیب ہوئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس کے بعد ہر ایکسڈنٹ میں مرنے والے کی گردن پر دیے ہی سوراخ جیسے نشان پائے گئے۔ پھر ایسا ہوا کہ جب نوپس کار کو وہی حادثہ پیش آیا تو اس کا ڈرائیور بھی اتنی دیر زندہ رہا کہ اپنا بیان دے سکے۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی انسپکٹر گنگولی کہ اس شخص کا بیان بھی پہلے مرے والے کے بیان سے لفظ بلفظ ملتا تھا۔“

دلپ نے حیرت سے کہا۔ ”آپ کا مطلب ہے اس کو بھی سرپا موڑ کے پاس اس طرح لڑکی ملی تھی؟“

”ہاں۔“ انسپکٹر جو گپال نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور اس لڑکی نے بھی یہی کہا کہ اس کی کار کا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔“

دلپ گہرا سانس لے کر بولا۔ ”اور اس نے بھی کار میں بیٹھنے کے بعد اپنے ہاتھ ڈرائیور کو دکھائے تھے اور اس کے ہاتھوں کے ناخن بھی اسی طرح اس کی گردن کی جاتے ہوئے تھے۔“

”ہاں۔“ انسپکٹر جو گپال نے بھاری گھمبیر آواز میں کہا۔ ”اس کے بعد سے اس بار پر یقین کر لیا گیا کہ اس موڑ پر ضرور کوئی بھوتی یا چڑیل رہتی ہے۔ بعد میں جب حادثوں کی دوبارہ جانچ کی گئی تو کئی چیزیں عجیب محسوس ہوئیں۔“

”وہ کیا چیزیں ہیں؟“

”مثلاً پہلی بات تو یہ ہے کہ حادثے میں مرنے والے ہر شخص کی گردن پر ویسے ہی نشانات ملتے تھے جیسے کسی نے ناخن چبھوئے ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ حادثہ ہمیشہ درج کی رات کو ہی ہوتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ حادثہ ہمیشہ سرپا موڑ پر ہی پیش آتا ہے۔ چوتھی بات یہ کہ حادثہ ہمیشہ اسی کار کو پیش آتا ہے جس میں صرف ڈرائیور ہوتا ہے، کوئی دوسرا مسافر نہیں ہوتا اور پانچویں بات یہ ہے کہ حادثہ ہمیشہ رات کو پیش آتا ہے۔ اس پر ان دنوں مرنے والوں کا بالکل ایک جیسا بیان۔ اب تم خود بتاؤ ان سب باتوں سے تم اور کیا نتیجہ نکال سکتے ہو؟“

”ویسے تو یہ سب باتیں اتفاق بھی ہو سکتی ہیں۔“ دلپ نے جواب دیا۔ ”میں اس بات کو لاجب اور سائنس سے اس طرح سمجھ سکتا ہوں کہ ہو سکتا ہے دو ج کی رات میں ہانڈ کی کرنیں اس موڑ پر کچھ اس طرح پڑتی ہوں کہ ڈرائیور کو کسی قسم کا نظری دھوکہ ہو جاتا ہو۔ اگر ہم اس بات کو مان لیں تو آپ کی کئی باتوں کا جواب آ جاتا ہے۔ اب رہی لڑکی کے ناخن بڑھنے والی بات اور گردن پر نشانات پائے جانے کی بات تو یہ ممکن ہے مرنے والوں نے بھوت پریت سے متعلق ایسا کوئی واقعہ بچپن میں سنا ہو اور مرنے سے پہلے ان ذہنوں میں وہی واقعہ رہ گیا ہو۔“

”پھر گردنوں پر نشانات کہاں سے آ گئے؟“ انسپکٹر جو گپال نے سوال کیا۔

”آپ خود کہہ چکے ہیں کہ پہلے تین واقعات میں گردن کے ان نشانوں پر توجہ نہ دی گئی تھی۔ اونچی جگہ سے کار گرنے کے حادثے میں کسی طرح کے بھی زخم آ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی جنگلی جانور ان لاشوں کو مھنہ بھونکنے کی شش کرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ حادثے کے بعد رات بھر لاش اس کھڈ میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔“

”تو گویا تم بھوتوں پر یقین کرنے کو تیار نہیں انسپکٹر دلپ۔“ انسپکٹر جو گپال نے کہا۔ ”ابھی تو نہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ آپ نے جو واقعات بتائے ہیں وہ بالکل انطرت محسوس ہوتے ہیں۔ پر اسرار اور خوفناک بھی ہیں۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ بھوت پریت صرف انسان کا واہمہ ہوتے ہیں۔ اصل میں ان کا کوئی وجود نہیں یا یہ

کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا اور اس کے منہ سے نکلا۔ ”او گاڈ۔ یہ تو سریش ہے۔“  
انسپکٹر جو گپال نے چونک کر دلیپ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم مرنے والے کو  
بانتے ہو؟“

دلیپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے لاش کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ  
ذمیرا دوست ہے۔ بچپن سے یہ میرا کلاس فیلو رہا ہے۔ تیسری کلاس سے بی اے تک ہم  
ایک دوسرے کے دوست رہے ہیں۔“



ٹھیک ایک مہینے بعد سب انسپکٹر دلیپ گنگولی انسپکٹر جو گپال کے پاس پہنچا اور  
لیوٹ مار کر بولا۔ ”سر۔ میں آج شام چھٹی پر جانا چاہتا ہوں۔“  
”کیا کوئی ضروری کام ہے؟“ انسپکٹر نے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

”آج دوج ہے سر۔“  
انسپکٹر جو گپال نے چونک کر کہا۔ ”دوج ہے تو کیا ہوا؟ تمہارا دوج سے کیا تعلق  
ہے؟“

”آج میں سرپا موڑ پر جا کر اس بھوتی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“  
”کیا تم پاگل ہو گئے ہو انسپکٹر دلیپ۔“ انسپکٹر جو گپال بولا۔ ”تم اپنے دوست کی  
لاش دیکھ چکے ہیں۔ پہلے کے دس کیسوں کی فائل دیکھ چکے ہو۔“

”لیس سر۔ اسی لیے میں جانا چاہتا ہوں۔ دس کیسوں کے بارے میں نہ پہلے مجھے کچھ  
علوم تھا نہ ان سے میرا کوئی تعلق تھا۔ لیکن گیارہواں کیس میرا ذاتی کیس بن چکا ہے۔  
کیونکہ سریش میرا بچپن کا دوست تھا۔ میرا لنگوٹیا یا تھا۔ مجھے اپنے بھائیوں کی طرح عزیز  
نہ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں ان حادثوں کی تہ تک پہنچ کر رہوں گا۔ اگر  
اقی سرپا موڑ پر کوئی بھوتی یا چیزیل رہتی ہے تو اب اس سے میری ذاتی دشمنی ہو گئی  
ہے۔ اب یا تو وہ نہیں رہے گی یا میں نہیں رہوں گا۔ اور اگر میرے اندازے کے  
اٹھوں کی وجہ کچھ اور ہے تو میں اس بھید کو بھی کھول کر رہوں گا تاکہ پھر کوئی اس موڑ پر  
مر سکے۔“

سمجھ لیجئے کہ جب تک میں خود کسی بھوت کو نہ دیکھ لوں میں ان باتوں پر یقین نہیں کر  
سکتا۔“

سرپا موڑ آچکا تھا۔ انسپکٹر جو گپال نے جیب روک لی۔ سڑک کے کنارے لگا ہوا  
لوہے کا جنگلہ کھڈ کی جانب کھڑا ہوا تھا۔ انسپکٹر جو گپال نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ کھڈ کافی  
گہرا تھا۔ نیچے چاکلیٹ رنگ کی ایک کار پڑی تھی۔  
”ایک چھٹی عجیب بات بھی ہے۔“ انسپکٹر جو گپال نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا؟“ دلیپ نے پوچھا۔  
”اتنی گہرائی میں گرنے کے بعد کار میں آگ لگ جانی چاہئے۔ لیکن آج تک جتنی  
کاریں اس کھڈ میں گری ہیں کسی میں آگ نہیں لگی۔“  
سب انسپکٹر دلیپ گنگولی کے ہونٹ بھیج گئے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”میں  
نہیں مان سکتا۔ میں کسی بھوت پریت پر اس وقت تک یقین نہیں کر سکتا جب تک خود نہ  
دیکھ لوں۔“

انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”اس کے علاوہ ایک بات اور عجیب ہے۔“  
”وہ کیا؟“ دلیپ کے منہ سے لاشوری طور پر نکلا۔

”ہر ڈرائیور جوان ہوتا ہے۔ کبھی کوئی بوڑھا ڈرائیور نہیں مرا۔“

”تو یہ گیارہواں ایکسڈنٹ ہے۔“ دلیپ بولا۔  
”ہاں۔“ انسپکٹر نے جواب دیا۔ ”آؤ نیچے چل کر دیکھتے ہیں۔ اس بار کون بد نصیب

موت کا شکار ہوا ہے۔“  
وہ ایک چکر کاٹ کر نیچے کھڈ تک پہنچے۔ کار کی اگلی سیٹ پر ایک شخص مردہ پڑا تھا  
کار ٹیڑھی پڑی تھی۔ انسپکٹر جو گپال نے اوپر کا دروازہ کھول کر سپاہیوں سے کہا۔ ”لاش  
باہر نکالو۔“

سپاہی کار پر چڑھ گئے۔ دونوں نے مل کر لاش کو باہر نکالا۔ انسپکٹر جو گپال نے ان  
مدد کی اور لاش کو نیچے رکھوا دیا۔  
سب انسپکٹر دلیپ گنگولی نے آگے بڑھ کر لاش کو دیکھا۔ لاش کا چہرہ دیکھتے ہی دا

”میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا مسٹر دلپ۔ بیٹھو اور ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ تم ابھی نوجوان ہو، جذباتی ہو۔ ہمارے سامنے گیارہ موتوں کا ریکارڈ موجود ہے۔ ہم جرائم پیشہ لوگوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں ان کو شکست دے سکتے ہیں لیکن کسی مافوق الفطرت قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

سب انسپکٹر دلپ گنگولی نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ”سرجو انسان پیدا ہوا ہے اس کو مرنا ضرور ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی پیدا ہوتے ہی مرجاتا ہے کوئی دس بیس سال بعد اور کوئی ساٹھ ستر سال کی عمر میں پہنچ کر مرجاتا ہے۔ مرنا لازمی ہے۔ میرے نقطہ نظر سے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ موت کب آتی ہے۔ موت کو جس وقت آئے گی اور جب موت آتی ہے تو اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔ میرا دوست نوجوان تھا۔ وہ خود یا اس کے دوست، رشتہ دار سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ اس طرح اچانک م جائے گا۔ اگر وہ اس حادثہ میں نہ مرتا تو وہ بھی ستر اسی سال کی عمر تک پہنچ سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کے مرنے سے دنیا کے کسی کام میں فزا نہیں پڑا۔ صرف اس کے دوست اور رشتہ داروں کو دکھ ہوا لیکن وہ دکھ بھی عارضی ہے چند سال بعد لوگ اس دکھ کو بھی بھول جائیں گے، اس لیے مجھے اپنی موت کی قطعی پز نہیں۔ البتہ اگر میری کوششوں سے ان حادثوں کا راز کھل جائے یا اگر واقعی سرباموڑ کوئی آسپی اثر ہے اور میں اپنی کوششوں سے اس اثر کو ختم کر سکوں اور اس جدوجہد میں میں تو میری زندگی سہل ہو جائے گی۔ پھر میرے مرنے کے بعد بھی لوگ مجھے رکھیں گے۔ ایک طرح سے مجھے نئی زندگی مل جائے گی، اس لئے جناب میں عہد کروں کہ میں رات کو اکیلا سرباموڑ پر ضرور جاؤں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اب مجھے میرا اس ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ کل صبح یا تو میں حاضر ہو کر اسی طرح آپ کو سلیا دوں گا یا اگر میں صبح دس بجے تک نہ پہنچوں تو آپ اس کھڈ سے آکر میری لاش نکال اور سمجھ لیجئے گا کہ اس بھوت نے مجھے اپنا بار ہواں شکار بنا لیا۔“

”پلیز انسپکٹر!“ انسپکٹر جو گپال بولا۔ ”بیٹھو تو سہی۔“

دلپ بیٹھ گیا تو انسپکٹر جو گپال نے کہا۔ ”دلپ تم میرے بیٹے کی طرح ہو۔ میری

وقت بچپن سال ہے۔ پولیس کی نوکری کرتے ہوئے تیس سال گزر گئے۔ جب میں ان تھا۔ تمہاری طرح میرے اندر بھی جوش اور جذبہ تھا تو میں بڑی سے بڑی طاقت کو طریق میں نہ لاتا تھا لیکن عمر کے بچپن سال گزرنے کے بعد میں بھی اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ بھگوان ضرور کوئی چیز ہے جسے پر ماتا کہتے ہیں۔ تم جانتے ہو گے پر ماتا کا مطلب ہے ب سے عظیم روح۔ اگر پر ماتا سب سے بڑی قوت سب سے عظیم روح ہے تو دوسری دھیں بھی ضرور ہوتی ہیں۔ ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ جسم میں آتما یا روح ہوتی ہے۔ ب روح نکل جاتی ہے تو جسم صرف مٹی کا ڈھیر رہ جاتا ہے اور مٹی میں مل جاتا ہے۔ ب اگر روح کا کوئی وجود ہے تو روح اچھی بھی ہو سکتی ہے بری بھی۔ ہم ہندوؤں کے فیدے کے مطابق مرنے کے بعد آتما کسی دوسرے جسم میں چلی جاتی ہے، جسے ہم اداگون کہتے ہیں لیکن کچھ آتماں زمین اور آسمان کے بیچ یا یہ کہہ لو کہ اس دنیا اور اس بنا کے بیچ چکراتی رہتی ہیں۔ ان میں نیک روحیں بھی ہوتی ہیں اور بری بھی۔ انہیں بری روح کو ہم بھوت، پریت یا چڑیل کہتے ہیں۔ چنانچہ اگر تم پر ماتا پر یقین رکھتے ہو تو تمہیں آتما کو بھی ماننا پڑے گا اور جب تم ان چیزوں کو مان لو گے تو تمہیں یہ بھی یقین کرنا پڑے گا کہ آتماں مافوق الفطرت چیز ہوتی ہیں۔ وہ ہر جگہ آ جا سکتی ہیں۔ وہ ایسے کام کر سکتی ہیں جو ہم انسان نہیں کر سکتے۔“

”جی نہیں۔“ دلپ بولا۔ ”میں آتما پر یقین کر سکتا ہوں، مگر یہ یقین نہیں کر سکتا روحیں یا آتماں اس دنیا میں آکر ہم انسانوں کے معاملات میں مداخلت کرتی ہیں۔ عال سر، میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنا بیٹا سمجھا اور میری بھلائی کے سواچہ میں ہزار بار گستاخی کی معافی چاہتے ہوئے عرض کروں گا کہ میں آج رات وہاں نے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ آپ مجھے اجازت دیجئے۔ ہو سکتا ہے آپ کا یہ منہ بولا بیٹا کچھ دکھائے۔“

انسپکٹر جو گپال کی تجربہ کار نگاہوں نے سمجھ لیا کہ دلپ کو اب اس ارادے سے کی قوت باز نہیں رکھ سکتی۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”آل رائٹ دلپ! اگر تم لڑو تو مجبور ہی ہے، لیکن میری ایک بات ضرور مان لو۔“

دلیپ نے انگوٹھی اتار کر شاہ صاحب کی جانب بڑھا دی۔ شاہ صاحب نے انگوٹھی اپنی مٹھی میں لے لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر آنکھیں بند کئے ہوئے خاموش بیٹھے رہے۔ شاید کچھ پڑھتے رہے، پھر آنکھیں کھولیں اور انگوٹھی دلیپ کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

”لو اس کو پہن لو اور جاؤ۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ خدا کے حکم کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں ٹال سکتی۔ بس اب تم لوگ جاسکتے ہو۔“

دلیپ گنگولی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ شاہ صاحب کی باتیں بالکل گول مول سی تھیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن انسپکٹر جو گپال نے اشارہ سے اس کو منع کر دیا۔ مجبوراً دلیپ اٹھ کھڑا ہوا اور شاہ صاحب کو سلام کر کے واپس چل دیا۔

دلیپ صرف حیران تھا۔ اس کے دل میں خوف رتی بھر نہیں تھا۔ سات بجے تک اس نے گھر پر آرام کیا، کھانا کھایا۔ ساڑھے سات بجے واپس پولیس اسٹیشن آیا اور پولیس کی جیب لے کر چل دیا۔

آج دوپہر سے ہی بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس کی گاڑی پولیس اسٹیشن سے باہر نکلی ہی تھی کہ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ریوالور اس کی پیٹی میں تھا۔ احتیاطاً ایک خنجر بھی اس نے اپنی پنڈلی پر ایک ربر بینڈ سے باندھ رکھا تھا۔ ایک طاقت ور ٹارچ ساتھ رکھ لی تھی۔

اپنی دانست میں پورا انتظام کر کے وہ سرپاموڑ کی طرف چل دیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ سورج پانچ بجے ہی چھپ جاتا تھا۔ ساڑھے سات بجے تک ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔ سرپاموڑ تک چالیس پینتالیس منٹ کا راستہ تھا۔ وہ بستی سے نکل کر چند میل ہی گیا ہو گا کہ بارش تیز ہو گئی۔ مگر وہ اپنی دھن کا پکا تھا، چلتا رہا۔ اگے بڑھتا رہا۔ اسے حیرت صرف یہ تھی کہ کیا اس بارش میں وہ بھتی کسی کا انتظار کر ہی ہوگی۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ بارش میں پہاڑی راستے کافی خطرناک ہو جاتے ہیں، اس لیے شاید ہمیں بھی نہیں چل رہی تھیں۔ وہ ماحول، اندھیرے اور بارش سے بے خوف

”کیا؟“

”پہلے وعدہ کرو کہ تم میری بات مان لو گے۔“  
”میں وعدہ کرتا ہوں سر۔ اگر وہ بات میرے سرپاموڑ جانے میں حارج میں ہوگی تو میں ضرور آپ کی بات مان لوں گا۔“

”تو آج دوپہر تم میرے ساتھ چلا۔“

”کہاں؟“

”تم نے ٹیکری گاؤں کے چاند شاہ کا نام سنا ہے؟“

”ہاں سنا تو ہے۔ کہتے ہیں کئی فقیر وہاں رہتے ہیں۔“

”وہ مسلمان ہیں مگر ان کو ہندو مسلمان سب ہی مانتے ہیں کہ ان میں روحانی طاقت ہے۔ تم دوپہر کو چل کر ان سے اپنی بات کرنا۔ شاید وہ کچھ مشورہ دے سکیں۔“  
دلیپ نے کچھ دیر سوچا۔ پھر بولا۔ ”اوکے سر۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔“

○☆☆○

چاند شاہ دبے پتلے آدمی تھے۔ سر کے بال، داڑھی کے بال حتیٰ کہ بھنویں روئی کے گالوں کی طرح سفید ہو گئی تھیں۔ چہرہ لال تھا۔ آنکھوں سے جلال برستا تھا۔ جس وقت انسپکٹر جو گپال اور دلیپ گنگولی پہنچے وہ ایک درخت کے سائے میں تھے۔ ضرورت مند لوگ، بیمار لوگ اور عقیدت مند لوگ ان کے چاروں طرف تھے۔ وہ دونوں بھی جا کر بیٹھ گئے۔ شاہ صاحب کی آنکھیں بند تھیں۔ کوئی ایک منٹ انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ دونوں انسپکٹروں کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولے۔

”پولیس افسروں کو ہم سے کیا کام آ پڑا ہے؟“

”شاہ صاحب!“ انسپکٹر جو گپال بولا۔ ”یہ انسپکٹر دلیپ گنگولی ہیں۔“

شاہ صاحب نے اپنی نظریں دلیپ کے چہرے پر جمادیں۔ کچھ دیر اس کو دیکھتے

پھر بولے۔

”برخوردار انسان سائنس میں کتنی ہی ترقی کر لے قدرت کے راز نہیں پا

تمہارے ہاتھ میں جو انگوٹھی ہے وہ ذرا اتار کر مجھے دے دو۔“

چلتا رہا مگر اس نے احتیاطاً جیب کی رفتار کم کر دی تھی۔

کئی بار اس کو ٹک گزرا کہ سڑک پر کوئی کھڑا ہے۔ کئی بار جیب کی تیز روشنی میں اسے کوئی چیز بھاگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ہر بار وہ سوچ لیتا کہ کوئی جنگلی جانور ہو گا۔

اور پھر آخر سرپاموڑ قریب آ گیا۔ آدھا میل دور سے ہی خطرے کی وارننگ کے نشانات نظر آنے لگے تھے۔ دلیپ کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ اب اس کے امتحان کا وقت آ گیا تھا۔ اس وقت اس کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔

”کیا وہ بدروح یا بھتنی مجھے ملے گی؟“

”اور اگر مل گئی تو مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

”کیا میں اس پر گولی چلاؤں گا؟“

”لیکن نہیں فوراً مجھے اس پر گولی نہیں چلانی چاہئے۔ پہلے دیکھنا چاہئے کہ وہ کس قسم کی یا کیا کرتی ہے۔“ اچانک اس کی جیب کو ایک جھٹکا سا لگا اور جیب الٹنے لگی۔

اس کا دھیان اس بھتنی کے بارے میں سوچنے میں لگا تھا۔ اچانک اس کو سڑک سے پتھوں پہنچ ایک انسانی سایہ نظر آیا جو دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھا اور بالکل لاشعور طور پر اس کا پاؤں بریک پر پڑ گیا اور اس سے جیب کو جھٹکا لگا تھا اور جیب الٹنے لگی۔

اس کے منہ سے گہرے سانس کے ساتھ نکلا۔ ”مائی گاڈ!“

ساتھ ہی اس نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ وہ سایہ ہاتھ ہلا کر اس کو روکنے اشارے کر رہا تھا۔ سرپاموڑ وہاں سے مشکل سے سو گز کے فاصلے پر ہو گا۔ بارش اسی ط موسلا دھار پڑ رہی تھی۔

ایک بار اس کے جی میں آیا کہ وہ جیب کو اس پر سے گزار دے لیکن سایہ قریب پہنچ کر اس کا پاؤں خود بخود بریک کو دباتا چلا گیا۔

جیب گاڑی عین اس سایہ کے پاس جا کر رک گئی۔ سایہ ابھی تک سڑک کے کنارے پہنچ کھڑا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے جیب کی تیز روشنی میں دیکھا۔

وہ ایک لڑکی ہی تھی اس کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے اور کاندھوں پر بکھرے رہے تھے، جن سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کے کپڑے اس کے سڈول جسم سے چپک گئے تھے۔

وہ خوبصورت تھی۔ بے حد خوبصورت۔ اس کی سر کے بال سنہرے تھے اور اس کا رنگ بے حد گورا تھا۔

دلیپ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے سوچا۔ ”تو بچ بچ اس موڑ پر یہ بھتنی ہی ہے۔“

یہ سوچتے ہوئے اس نے آہستہ سے ایک ہاتھ سے اپنا ریوالتور ہولشر سے نکال کر ہاتھ میں رکھ لیا۔ جیب رکے ہی وہ لڑکی کھڑکی میں آئی اور بولی۔

”معاف کیجئے۔ بارش بہت تیز ہے اور میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟“ دلیپ نے ٹائرج اٹھا کر روشنی لڑکی کے منہ پر ڈالی۔ اب اس نے لکھا کہ اس کی پلکیں بھی سنہری تھیں اور آنکھوں کا رنگ شربتی تھا۔ وہ ہندوستانی سے بازہ انگریز لڑکی لگ رہی تھی مگر اس کے جسم پر لباس ہندوستانی ہی تھا۔ لباس بھیگ کر لک لڑکی کے جسم سے چپک گیا تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ لباس کیا تھا۔

پہلے اس نے سوچا کہ وہ منع کر دے لیکن وہ اسی سے تو ملنے آیا تھا۔ اس لئے اس نے۔ ”آپ کی گاڑی کہاں ہے؟“

”میں پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ میں نے سوچا تھا پیدل ہی گاؤں تک پہنچ جاؤں گی لیکن اچانک تیز ہو گئی۔“

دلیپ سوچ میں پڑ گیا کہ کیا جواب دے۔ لڑکی نے اس کو خاموش دیکھ کر کہا۔

میری مدد کیجئے مجھ سے ڈریئے نہیں۔ میں کوئی بھوت نہیں ہوں۔“

دلیپ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ اگر بھوت بھی ہیں تو بھی پ سے خوفزدہ نہیں ہوں۔“

”تو آپ میری مدد کرنے کو تیار ہیں۔“



”جی ہاں۔ آپ بیٹھ سکتی ہیں۔“

”شکریہ۔“ یہ کہہ کر لڑکی نے پہلے اگلی سیٹ پر بیٹھنا چاہا لیکن پھر رک کر پچھا سیٹ پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”میں آگے اس لیے نہیں بیٹھی کہ میرے کپڑے گیلے تھے۔ آہ بھی بھیک جاتے۔“

”شکریہ۔“ دلپ نے ایکسیلٹر پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو کہاں جانا ہے؟“

”آگے ایک گاؤں ہے۔“ لڑکی بولی۔

”مجھے معلوم ہے۔“

”اس گاؤں سے کوئی آدھا میل پہلے ہی ایک راستہ بائیں طرف کو کٹ جاتا ہے آپ کو اس راستہ پر گھومنا ہوگا۔ وہاں سے میں آپ کو راستہ بتاتی رہوں گی۔ تھوڑے فاصلے پر ہی ہماری حویلی ہے۔“ دلپ سوچنے لگا اگر یہ وہی بھتیجی ہے جو اب تک گیا انسانوں کی جان لے چکی ہے تو پڑھی لکھی اور منہ بولتی ہے۔

دلپ نے سوال کیا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیا جگہ ہے؟“

”جی ہاں اس کو سراپا موڑ کہتے ہیں۔“ لڑکی نے جواب دیا پھر قہقہہ لگا کر کہا ”ارے کہیں آپ مجھے وہ بھتیجی تو نہیں سمجھ رہے ہیں جو اب تک یہاں گیارہ آدمیوں گرا چکی ہے۔“

عقب نمائش میں دونوں کی نظریں چند لمحوں کے لیے ملی رہیں پھر دلپ نے کہا

”کیا آپ ہیں؟“

”کون، وہ بھتیجی؟“

”جی ہاں۔“

”اگر میں یہ کہوں کہ ہوں تو؟“ لڑکی کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔

”تو مجھے پہلے سے بتا دیجئے گا کہ سراپا موڑ پر کس طرح اپنی گاڑی کو کھڈ میں ہوگا۔“ دلپ اگرچہ بڑی بے جگری سے باتیں کر رہا تھا لیکن اس کے اندر عجیب سی مچی ہوئی تھی۔ اس کا دل ریل کے انجن کی طرح دھک دھک کر رہا تھا۔

لڑکی نے عقب نمائش میں اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ اتنے ہنڈم ہیں کہ

میں بھتیجی بھی ہوں تو بھی آپ کو کھڈ میں نہیں گراؤں گی۔“ یہ کہہ کر لڑکی نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔

اور پھر موڑ آگیا۔ لڑکی نے کہا۔ ”سنہل کر۔ رفتار ذرا کم کر دیجئے۔“

دلپ کی گرفت اسٹیرنگ پر سخت ہو گئی۔ موڑ آیا اور نکل گیا۔

اسے حیرت ہوئی کہ اس نے خیریت سے موڑ پار کر لیا تھا۔ موڑ سے گزرنے کے بعد اس نے کہا۔

”کیا آپ مجھے اپنے ہاتھ دکھا سکتی ہیں؟“

”میرے ہاتھوں کے ناخن لمبے نہیں ہوتے۔“ یہ کہہ کر لڑکی نے قہقہہ لگا کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ اس کے ہاتھ بالکل انسانوں جیسے تھے۔

”تو یہ بھتیجی نہیں۔“ دلپ نے سوچا۔ ”کوئی سچ کچ کی لڑکی ہے۔“

یہ جان کر اس کے دل کو کچھ سکون ہوا۔ جسم کے اندر کا تناؤ بھی ختم ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مایوسی بھی ہوئی۔ وہ جو توقع لے کر آیا تھا وہ پوری ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔

موڑ سے بخیریت گزرنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ”تو آپ اس بھتیجی کے بارے میں جانتی ہیں؟“

”کون نہیں جانتا۔“

”آپ اس علاقے میں رہتی ہیں تو اکثر آپ بھی رات کو آتی جاتی ہوں گی۔ کیا

آپ نے کبھی اس بھتیجی کو دیکھا ہے؟“

لڑکی نے پھر قہقہہ لگا کر کہا۔ ”اگر میں یہ کہوں کہ میں ہی وہ بھتیجی ہوں تو؟“

”تو میں یقین نہیں کروں گا۔“ دلپ نے پہلی بار مسکرا کر کہا۔ ”کیوں کہ اگر آپ

بھتیجی ہوتیں تو پروگرام کے مطابق میری جیب کو سراپا موڑ پر کھڈ میں گر جانا چاہئے تھا۔“

”تو آپ مجھ سے بالکل خوفزدہ نہیں ہیں؟“

”ہرگز نہیں۔“

”چلئے یہ بھی اچھا ہوا۔ دیکھئے اب تھوڑے فاصلے پر ہی بائیں جانب ایک راستہ کٹے

کے گاڑی سے اتر کر وہ پچھلی طرف آیا تو وہ نہیں تھی۔

ایک ہلکی سی سنسنی اس کے سارے بدن میں پھیل گئی۔ اس نے سوچا۔ ”کیا بچ وہ بھوت تھی؟“

لیکن پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دے لیا۔ ”نہیں۔ بھوت پریت کا اس دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ یہ سب انسان کا دماغ ہوتا ہے۔ وہ لڑکی گاڑی رکھتے ہی اتر کر اندر مکان میں چلی گئی ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ اسے اتر کر اخلاقاً میرا شکریہ ادا کرنا چاہئے تھا۔ اندر ساتھ چلنے کو کہنا چاہئے تھا لیکن دنیا میں خود غرض اور بد اخلاق آدمی بھی تو رہتے ہیں۔“

یہ سوچ کر اس نے کاندھوں کو اچکایا اور واپس ڈرائیور کی سیٹ کی طرف چل دیا۔ وہ ایک قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ آواز ایسی تھی جیسے کوئی دروازہ برسوں سے بند ہو اور اب کھولا گیا ہو۔ اس نے جلدی سے گھوم کر دیکھا۔

پوری عمارت اس وقت تک اندھیرے میں ایک دھندلے سائے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اب اس نے دیکھا کہ عمارت کا دروازہ بہت آہستہ آہستہ خود بخود کھل رہا تھا۔ جیسے ہوا کو اڑوں کو دھکیل رہی ہو یا کوئی نامعلوم شخص دروازہ کھول رہا ہو۔

وہ حیرت سے بت بنا دیکھتا رہ گیا۔ پورا دروازہ کھلنے پر اسے اندر کا منظر نظر آیا۔

لمبی ڈیڑھ سی کے پار ایک اوپر دروازہ تھا۔ وہ دروازہ بھی اس وقت کھلا ہوا تھا۔ آگے ایک بڑا ہال تھا۔ اس ہال میں شاید ایک ہی شمع روشن تھی۔ بہت مدہم روشنی ہال میں پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن روشنی اتنی ضرور تھی کہ وہ چھت پر لٹکا ہوا قیمتی فانوس دیواروں پر لگے جھاڑ اور کھڑکیوں پر ہوا سے لہراتے پردے دیکھ سکتا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی ٹائم مشین نے اس کو دو سو سال پیچھے کے زمانے میں کسی راجہ کے محل کے سامنے لا کھڑا کیا ہو۔ اسے حیرت ہوئی کہ پہاڑی کے اس غیر آباد علاقہ میں ایسا خوبصورت محل ہے اور کبھی کسی نے اس جگہ کے بارے میں ذکر نہیں کیا۔

”یہاں کون رہتا ہے اور وہ لڑکی کون ہے؟“ اس کے ذہن میں دو سوال اٹھے۔

تجسس نے اس کے اندر ایک قسم کی بے باکی بھر دی۔ اس نے سوچا۔ ”اگر اس لڑکی نے مجھے اندر آنے کی دعوت نہیں دی تو کیا ہوا۔ مجھے خود اندر جا کر دیکھنا چاہئے اور

گا۔ آپ اس راستے پر گاڑی موڑ لیجئے گا۔“

”کیا آپ گاؤں میں نہیں رہتیں؟“

”جی نہیں۔ ہماری حویلی بالکل الگ تھلگ ہے۔ ہماری ماں کو میرا مطلب ہے آپ کی زبان میں مٹی کو گاؤں کے لوگوں سے میل جول پسند نہیں۔“

اچانک بائیں جانب ایک راستہ کھٹا ہوا محسوس ہوا۔ دلیپ نے گاڑی کی رفتار مدہم کر کے گاڑی کا رخ اس راستے پر موڑ دیا۔

دلیپ کو اب یقین ہو چکا تھا کہ اس کی محنت بیکار گئی۔ شاید دوج کا چاند نظر نہ آنے کی وجہ سے وہ بھتنی نہیں آئی تھی یا شاید تیز بارش سے ڈر گئی تھی۔ اسے افسوس تھا کہ وہ بھتنی اسے نہ مل سکی تھی مگر دل میں ایک نامعلوم سوچ بھی تھی۔ یہ لڑکی اسے اچھی لگی تھی۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے اسے اچھا لگ رہا تھا۔ البتہ ایک بات اسے عجیب سی لگ رہی تھی جب سے وہ لڑکی اس کی جیب میں بیٹھ تھی ایک عجیب طرح کی بو اسے محسوس ہو رہی تھی جسے نہ وہ خوشبو کہہ سکتا تھا نہ بدبو، مگر وہ اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا یہ بو یا خوشبو یا تو لڑکی کے جسم سے پھوٹ رہی ہے یا پھر اس نے کسی ستم کا سینٹ یا عطر لگا رکھا ہے۔

لڑکی اس کو راستہ بتاتی رہی۔ وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے نہ جانے کتنے موڑ مڑے۔ آخر راستہ ختم ہو گیا اور گاڑی ایک بہت بڑی اور بہت شاندار حویلی کے سامنے جا پہنچی۔

”لیجئے منزل آگئی۔“ دلیپ نے کہا اور گاڑی کا انجن بند کر کے وہ نیچے اترا۔ گھوم کر پچھلی طرف آیا اور اندر جھانکتے ہوئے بولا۔

”آپ کا گھر آگیا ہے مادام.....“

لیکن الفاظ اس کے منہ میں ہی گھٹ کر رہ گئے۔ پچھلی سیٹ پر کوئی نہ تھا۔

وہ بھنی بھنی آنکھوں سے خالی جیب کو دیکھتا رہ گیا۔

چند لمحوں کے لئے دلیپ گنگولی حیران و پریشان کھڑا رہ گیا تھا کہ لڑکی اچانک کہاں غائب ہو گئی۔ ابھی وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ انجن بند کر

ہے ہاتھوں میں تلواریں تھیں اور سروں پر تاج تھے اور عورتیں رانیوں کے لباس میں  
نیں، زیوروں سے بچی ہوئی۔ ہال کی دیواروں پر چاروں طرف تصویریں تھیں۔ دلیپ  
نے سوچا۔ ”شاید اس مکان کے آباء اجداد کی تصویریں ہیں۔“

اچانک چلتے چلتے دلیپ کے قدم رک گئے اور اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے  
پل کی دھڑکن روک دی ہو۔ اس کے منہ سے ایک گہرے سانس کے ساتھ نکلا۔ ”ہے  
بلوان یہ تو اسی کی تصویر ہے۔“

اس تصویر میں وہی لڑکی تھی جو ابھی ابھی اس کی گاڑی میں اس کے ساتھ آئی تھی  
اور اچانک غائب ہو گئی تھی۔ تصویر میں وہ بھی رانیوں جیسا ہی لباس پہنے ہوئے تھی۔ وہ  
برت سے کھڑا اس تصویر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک سارے ہال میں اندھیرا چھا گیا۔ ہوا کا  
ایک تیز جھونکا اس کے بدن میں کپکپی پیدا کرتا ہوا گزر گیا۔ اس نے سوچا شاید ہوا سے شیخ  
بجھ گئی ہے لیکن اس کے فوراً بعد ایسا محسوس ہوا جیسے ہال میں طوفان آگیا ہو۔ دسیوں  
ہنگاموں جیسے ادھر ادھر پھڑپھڑانے لگیں۔ کئی بار اسے ایسا لگا جیسے ابھی کوئی چگاڑا اس کے  
چہرے سے چٹ جائے گی۔ ان کے پروں سے حرکت میں آنے والی ہوا کو وہ اپنے چہرے  
پر محسوس کر سکتا تھا۔ ایک بار پھر خوف کی پھریری اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ اس  
نے سوچا کہ وہ باہر بھاگ جائے۔ لیکن اندھیرے میں دروازہ تلاش کرنا مشکل تھا۔ اس  
وقت سچ مچ اتنا گہرا اندھیرا تھا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اندھیرے کو محسوس کر سکتا تھا۔ دوسرا  
اسے ڈر تھا اپنی جگہ سے حرکت کرنے پر کہیں واقعی کوئی چگاڑا اس کے چہرے پر آکر نہ  
چپک جائے۔ اس تصور سے ہی اس کی رگوں میں کراہت جیسی کوئی شے دوڑ جاتی۔ نہ  
نے یہ اس پر خوف کا اثر تھا یا اس کی سمجھداری تھی کہ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ نہ  
نے کتنی دیر چگاڑوں اس کے گرد پھڑپھڑاتی رہیں، اڑتی رہیں۔ لیکن کوئی اس کے بدن  
پر نہ ٹکرائی۔ کئی بار ایسا لگا کہ کوئی چگاڑا اس کے جسم سے اس کے چہرے کے بالکل  
بب آئی ہے اور پھر اچانک اپنا راستہ موڑ کر دور ہٹ گئی ہے۔

اسے وقت کا احساس بھی نہ رہا تھا۔ خدا جانے چند منٹ گزرے تھے یا ایک گھنٹہ۔  
ایک پھر ویسی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس بار آواز اوپر کی منزل سے آئی تھی۔ اس

جاننا چاہئے کہ یہاں کون رہتا ہے۔ ایک پولیس افسر ہونے کی حیثیت سے بھی میرا فرض  
ہے کہ علاقے میں رہنے والے بڑے لوگوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے بارے میں جانکاری  
رکھوں۔“

یہ سوچ کر وہ دروازے کی طرف چل دیا۔ ریوالور جو اس نے راستے میں ہولسٹر  
سے نکال کر اپنی گود میں رکھ لیا تھا، اب جیب میں رکھ لیا تھا۔ ابھی تک اس کے ذہن میں  
کسی طرح کا خوف پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا دروازے تک پہنچا۔  
دروازے سے اندر قدم رکھتے ہوئے البتہ ایک بار اس کے بدن میں جھرجھری سی آئی۔  
ایک بار اس نے سوچا۔

”اندر پتہ نہیں کون ہو گا؟“

لیکن وہ اندر داخل ہو کر ڈیوڑھی سے گزر گیا۔ دوسرے دروازے کے قریب پہنچا  
ہی تھا کہ پھر ویسی ہی چرچاہٹ کی آواز نے اس کو چونکا دیا جیسے کوئی برسوں بند رہنے والا  
دروازہ کھلا ہو۔ اس نے جلدی سے گھوم کر دیکھا۔

پہلی بار خوف کی ہلکی سی سنسنی اس کے بدن میں دوڑ گئی۔

باہر کا دروازہ آہستہ آہستہ بند ہو رہا تھا۔ بند کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

اچانک ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس کو اپنے بدن سے چھوٹا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے دل  
ہی دل میں خود سے کہا۔ ”میرے اعصاب کشیدہ ہونے لگے ہیں۔ ہوا کے جھونکوں سے  
دروازہ بند ہوا ہے۔“ یہ سوچتے ہوئے وہ ہال میں داخل ہو گیا۔

وہ یہ اندازہ لگانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا کہ ہال میں روشنی کہاں سے آ رہی  
تھی۔ شاید کسی فانوس میں کوئی شمع روشن تھی۔ سارا ہال پرانے انداز کے فرنیچر سے سجا  
ہوا تھا۔ فرش پر قالین تھا۔ ایک طرف لمبی چوڑی میز کے گرد کرسیاں بچھی تھیں۔  
دیواروں پر ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویریں لگی تھیں۔ یہ تصویریں راجاؤں، راجکماروں اور  
رانیوں کی لگتی تھیں۔ وہ آگے بڑھ کر ان تصویروں کو دیکھنے لگا۔ روشنی اگرچہ مدہم تھی  
لیکن اتنی ضرور تھی کہ وہ تصویروں کے چہرے دیکھ سکتا تھا۔ ان تصویروں میں جتنے مردوں  
کی تصویریں تھیں وہ سب پرانے زمانے کے راجاؤں جیسے لباس پہنے ہوئے تھے۔ سب

نیچے بیٹھے ہی اس کی انگلی ریوالور کا ٹریگر دبا چکی تھی۔ گولی کا دھماکا اس مکان میں اس طرح گونجا جیسے بم پھٹا ہو۔

اسی وقت پھر اس کمرے میں روشنی ہو گئی جس میں پہلے تھی۔ اور اس کی مدہم روشنی میں اس نے ایک بہت بڑی بلی کو بھاگ کر اسی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا جس میں سے روشنی باہر آرہی تھی۔

جس وقت بلی نے اس پر حملہ کیا تھا اس وقت بھی اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے بلی اس کے گلے کو دیوچ لے گی۔ اس نے بلی کے جسم سے حرکت میں آنے والی ہوا کو محسوس کیا تھا لیکن بلی اس کے برابر میں آکر گری تھی اور پھر روشنی ہوتے ہی پلٹ کر کمرے میں بھاگ گئی تھی۔

بلی کے غائب ہو جانے پر وہ کچھ دیر کھڑا اپنے حواس درست کرتا رہا پھر اس نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے پکار کر کہا۔

”کیا کوئی اندر ہے؟“

اس کی آواز بازگشت بن کر گونج گئی۔ کوئی جواب نہ ملا تو اس نے دوبارہ پکارا۔

”کوئی اندر ہے؟“

اس بار جواب میں اس کمرے سے ایسی آواز آئی جیسے کسی نوجوان لڑکی نے قہقہہ لگایا ہو۔

”ضرور اندر وہی لڑکی ہے۔“ دلپ نے سوچا اور وہ اس دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ یہ کمرہ خواب گاہ معلوم ہوتا تھا۔ ایک قدیم طرز کی خوبصورت مسری بچھی تھی۔ ایک طرف سنگھار میز تھی اور وہی لڑکی سنگھار میز کے سامنے کھڑی اپنے بالوں میں کنگھا کر رہی تھی۔ اس کے بال اتنے لمبے اور گھنے تھے کہ اس کے گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔ لڑکی کا آدھا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ مدہم روشنی میں بھی لڑکی کو پہچاننے میں اسے ذرا دشواری نہ ہوئی۔

سے پہلے مدہم روشنی میں وہ دیکھ چکا تھا کہ ہال کے کونے سے ایک زینہ اوپر جاتا ہے۔ آواز کے ساتھ ہی اوپر کسی کمرے میں روشنی ہوئی۔ اس روشنی سے ہال کا گہرا اندھیرا کسی حد تک کم ہو گیا اور اس روشنی کے ساتھ ہی اچانک وہ چمکداری غائب ہو گئیں۔ پتہ نہیں ڈر کر بھاگ گئیں یا دیواروں سے چمٹ گئیں۔ اب وہ پھر سے ہال میں رکھے فرنیچر کو دیکھ رہا تھا۔ روشنی اس قدر کم تھی کہ اس بار وہ ان چروں کے سائے محسوس کر سکتا تھا۔

اس نے سوچا ضرور اوپر کوئی ہے۔ شاید وہی لڑکی؟

یہ سوچ کر خود بخود اس کے قدم زینے کی جانب اٹھ گئے۔

وہ بھوت پریت کو نہیں مانتا تھا۔ وہ خوفزدہ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی اسے یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ اس مکان میں سب کچھ ”نا رمل“ نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

زینہ پر قدم رکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اپنا ریوالور ہاتھ میں لے لیا ریوالور ہاتھ میں لیتے ہی اسے خیال آیا کہ وہ نارچ بھی تو ساتھ لایا تھا جو گاڑی میں ہے۔ ایک بار اس نے سوچا کہ وہ باہر جا کر گاڑی سے نارچ نکال لائے لیکن اس وقت وہ آدھا زینہ طے کر چکا تھا۔ اس لیے اس نے واپس جانا مناسب نہ سمجھا۔

وہ زینے کی آخری سیڑھی پر پہنچا ہی تھا کہ اچانک وہ روشنی بھی غائب ہو گئی اس بار روشنی غائب ہوتے ہی اس کو اندھیرے میں دو آنکھیں انگاروں کی طرح محسوس ہوئیں۔

اس لمحہ کے ہزارویں حصہ میں اس کے ذہن نے کہا۔ ”کوئی جنگلی جانور ہے؟ سوچ کر اس کا ہاتھ خود بخود حرکت میں آ گیا۔ ریوالور والا ہاتھ آگے بڑھا کر وہ فائر کر چاہتا تھا کہ اس جانور نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ اس جانور کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کی انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی دونوں آنکھوں کو اچھل کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ گھبرا کر وہ نیچے بیٹھ گیا۔ اگر وہ ذرا بھی پیچھے ہٹتا تو زینہ پر لڑھک کر نیچے کیونکہ وہ آخری سیڑھی کے بالکل کنارے پر کھڑا تھا۔

معلوم ہو جائے گا۔ آپ تشریف تو رکھئے۔“

دلیپ کے ہاتھ میں ابھی تک ریوالمور تھا۔ وہ مسہری کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں دو سوال اٹھ رہے تھے۔ اس لڑکی نے ابھی تک دھماکے کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا نہ ہی اس کے ہاتھ میں ریوالمور دیکھ کر لڑکی نے حیرت ظاہر کی تھی۔

لڑکی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کنگھا تھا۔ خالی ہاتھ اس نے دلیپ کی جانب بڑھا کر کہا۔ ”لایئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیجئے۔ آپ کو پتہ چل جائے گا کہ میں کون ہوں۔“

لڑکی کا رویہ دلیپ کو بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ پھر بھی لاشعوری طور پر اس نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ایک انچ رہ گیا ہو گا کہ لڑکی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور خوفزدہ لمبے میں بولی۔

”نہیں..... نہیں..... میں تمہیں نہیں چھو سکتی۔“

”کیا ہوا؟“ دلیپ نے حیرت سے کہا۔ ”تم نے ہی تو مجھے ہاتھ آگے بڑھانے کو کہا

تھا۔“

لڑکی دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ”ایک بات بتائیے۔“

”پوچھو!“

”میں آپ کو کیسی لگ رہی ہوں؟“

”تم بہت خوبصورت ہو۔“

”کیا واقعی؟“

”اس میں شک نہیں کہ تم بے حد خوبصورت ہو۔“

”کیا میں اتنی خوبصورت ہوں کہ آپ کے دل میں مجھے حاصل کرنے کی تمنا ہو؟“

”ہاں؟“

”ہاں۔“ دلیپ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم اتنی ہی خوبصورت ہو کہ ہر مرد کے

دل میں تمہیں حاصل کرنے کی تمنا پیدا ہو سکتی ہے۔“

لڑکی نے اس کی طرف سر نہیں گھمایا۔ اسی طرح شیشے کی طرف منہ کئے کنگھا کرتے ہوئے بولی۔ ”آئیے۔ اندر آجائیے۔“

وہ اندر داخل ہوا۔ لڑکی اپنا لباس بدل چکی تھی۔ اب اس کے کپڑے پھیکے ہوئے نہیں تھے، بلکہ اس کے بدن پر کسی ریشمی کپڑے کا لباساگون تھا جو اس کے پیروں تک کو چھپائے ہوئے تھا۔

کمرے میں اندر قدم رکھتے ہوئے دلیپ نے کہا۔ ”آپ اچانک گاڑی میں سے کہاں غائب ہو گئی تھیں؟“

”نہیں تو۔“ لڑکی نے اسی طرح شیشے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تو آپ کے سامنے گاڑی سے اتر کر آئی تھی، مگر اس وقت شاید آپ کی توجہ انجن کی طرف تھی۔ پھیکے کپڑوں میں مجھے سردی لگ رہی تھی میں نے سوچا تھا آپ اندر آ ہی جائیں گے۔“

ابھی تک وہ اس کا آدھا چہرہ ہی دیکھ پا رہا تھا۔ اب پہلی بار لڑکی اس کی طرف گھومی۔ کھلے ہوئے بالوں نے اس کا آدھا چہرہ ڈھک لیا تھا۔ وہ مسہری کی جانب اشارہ کر کے بولی۔

”تشریف رکھیں۔ باہر تیز بارش اور طوفان ہے۔ آج رات آپ میرے مہمان ہیں۔“

وہ مسہری کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ”کیا اس مکان میں آپ اکیلی ہیں؟“

”اس وقت تو اکیلی ہی ہوں۔“

”میں سمجھا نہیں..... کیا آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں۔“ اس نے حیرت سے سوال

کیا۔

”سب کچھ پہلی ملاقات میں ہی جان لینا چاہیں گے کیا؟“ لڑکی نے اپنے لمبے بالوں کو

کنگھی کے ذریعہ اپنے آدھے چہرے پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

”آپ نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے۔“ دلیپ بولا۔ ”ابھی تک آپ نے یہ بھی

تو نہیں بتایا کہ آپ کون ہیں۔ یہ مکان کس کا ہے، یہاں کون رہتا ہے؟“

وہ لڑکی اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ ”ذرا صبر کریں۔ آپ کو سب کچھ

دلپ کو اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ سچ نہ ہو۔ حقیقت نہ ہو بلکہ وہ اب دیکھ رہا ہو۔ اس کے شعور کے کسی کونے میں بس خطرے کی ہلکی سی گھنٹی بج رہی ہے۔ ایک کمزور آواز کہہ رہی تھی۔

”تم غلط کر رہے ہو دلپ!“

لیکن لڑکی کی خوبصورتی نے اس کے حواس پر پوری طرح قبضہ کر لیا تھا۔ لڑکی کو مل کرنے کی خواہش اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ اب اسے نہ اخلاق کی پرواہ تھی نہ ذہن تھا کہ مکان میں لڑکی کے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے ریو اور اپنی بات میں رکھ کر لڑکی کی طرف ایک قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آؤ میرے قریب آؤ اور بتاؤ کہ تم کون ہو؟“

”ایسے نہیں۔“ لڑکی بولی۔ ”آگے مت بڑھو۔“

”پھر کیسے؟“ وہ رک گیا۔

”ہمارے درمیان کوئی پردہ نہیں رہنا چاہئے۔“

”کیسا پردہ؟“

”یہ کپڑے پردہ ہی تو ہیں۔ مجھے پیار کرنا چاہتے ہو تو جسم سے سب کچھ اتار دو۔ تم پھر میں۔“

دلپ نے اپنے کپڑوں کو دیکھا پھر ادھر ادھر دیکھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ اس نے کہا۔

”دروازہ کھلا ہے۔ کوئی اندر آ سکتا ہے۔“

”یہاں کوئی نہیں آ سکتا۔ اس وقت صرف میں اور تم ہیں۔ ڈرو مت میں بھی تم پر ہمارے لگی ہوئے۔ اب تم میرے ہو۔ میں تمہاری ہوں۔ اب سدا تم میرے رہو۔“

لیکن یہ کہتے ہوئے وہ جیسے ہی اس کے قریب پہنچی اس کی انگلیاں دلپ کی انگلیوں نے والے تھیں کہ اچانک لڑکی کے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی اور پھر وہ جلدی سے رو دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اسی وقت لڑکی کے بال اس کے آدھے چہرے سے ہٹ کر نرکاندھوں پر بکھر گئے۔ آدھا چہرہ جو بالوں میں چھپا ہوا تھا، کھل گیا۔ اس آدھے

”آپ کے دل میں بھی پیدا ہوئی ہے؟“

”ہاں۔“

دلپ حیران تھا کہ اسے کیا ہو رہا ہے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس لڑکی کے حواس نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ اس کے دل میں واقعی لڑکی کو حاصل کرنے کی تمنا سراپا ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے اپنی بانسوں میں بھر کر اس کے سڈول جسم پر اپنی ہونٹوں کے پھول کھلا دے۔ اس کے دل میں اب کسی طرح کا خوف نہیں تھا صرف ایک خواہش تھی۔

”اس لڑکی کو حاصل کیا جائے۔“

وہ حیران تھا کہ اسے کیا ہو رہا ہے۔ کوئی نامعلوم طاقت اس کے خیالات کو مرضی کے مطابق ڈھال رہی تھی۔ اس کے اندر اس خواہش کو تیز سے تیز کرتی جا رہی تھی۔ اس کا جذبہ شوق بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

لڑکی کا آدھا چہرہ ابھی تک بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے دلپ سے کہا۔

”آپ مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں؟“

”ہاں۔“ دلپ بولا اور مسری سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔

”ابھی ٹھہرو۔“ لڑکی نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”پہلے میری کچھ بات۔“

جواب دو۔“

دلپ ٹھہر گیا اور بولا۔ ”بولو کیا پوچھنا چاہتی ہو۔“

”تم مجھے اسی وقت حاصل کرنا چاہتے ہو؟“ اس نے ذرا بے تکلف ہو کر کہا۔

”ہاں۔“

”اس کے لیے تمہیں ایک وعدہ کرنا ہو گا۔“

”کیسا وعدہ؟“

”جو میں کہوں گی وہ کرنا ہو گا۔“

بغیر سوچے سمجھے دلپ گنگولی نے کہا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں جو تم کو ملے گا۔“

”گا۔“



اور کوشش کے باوجود وہ اپنے ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکا۔

اور وہ ناخن اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے رہے۔ فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے ناخن اس کی گردن تک پہنچ رہے تھے۔ دھیرے دھیرے موت اس کی طرف بڑھ رہی تھی اور وہ بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔

اچانک ایک معجزہ ہو گیا۔ وہ ناخن اس کی گردن سے مشکل سے چوتھائی انچ کے فاصلے پر رہ گئے تھے کہ لڑکی کے منہ سے پھر چیخ نکلی۔ ساتھ ہی ناخن ایک دم سمٹ کر غائب ہو گئے اور اس کے خالی ہاتھ فضا میں پھیلے رہ گئے۔ ساتھ ہی اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ”کیا ہے؟ کیا ہے تمہارے پاس؟ میں نے تمہارے جسم سے سارے کپڑے اسی لئے اتروائے تھے کہ میں تمہیں چھو نہیں سکتی تھی۔ تمہارے اور میرے بیچ ایک دیوار تھی، لیکن کپڑے اتارنے کے باوجود میں تمہیں نہیں چھو سکتی۔ اب تمہارے جسم پر کیا ہے؟ تم میں ایسی کون سی طاقت ہے جو میرے ہاتھ تم تک نہیں پہنچ سکتے؟“

دلپ گنگولی کو بھی اس کے ساتھ ہی اچانک ہوش آ گیا تھا۔ اس کے جسم میں زندگی واپس آ گئی تھی۔ اس نے جلدی سے جھک کر اپنے کپڑے اٹھائے اور کپڑے پہنتے ہوئے بولا۔

”تو تم سچ بچ بھوت ہو۔ میں سمجھتا تھا بھوت پریت صرف انسانی واہمہ ہوتا ہے لیکن آج مجھے پتہ چلا کہ تم وہم نہیں ہو۔ سچ بچ بھوت ہو۔ جڑیل ہو۔“

”نہیں۔“ لڑکی بولی۔ ”میں بھوت نہیں۔ میں تمہاری طرح ہوں۔ میرا جسم ہے۔ تم مجھے چھو کر دیکھ سکتے ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں تمہاری طرح کی انسان نہیں ہوں۔“

”پھر کس طرح کی انسان ہو؟“ دلپ نے سوال کیا۔

”ایک شرط پر میں تمہیں سب کچھ بتا سکتی ہوں۔“

”کیا شرط ہے؟“

”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ آج کی رات میرے لیے ایک اہم رات ہے۔ تمہیں میری مدد کرنی ہوگی۔ وعدہ کرو کہ تم میری مدد کرو گے اور جو میں کہوں گی وہ کرو۔“

چہرے پر نظر پڑتے ہی دلپ کے منہ سے بھی خوف کی ایک چیخ نکلی اور جیسے اسے ہوش گیا۔ اس نے پھرتی سے جھک کر اپنا کوٹ اٹھا لیا جس میں ریو الوور تھا..... اور ریو الوور نکالتے ہوئے بولا۔ ”تو تم انسان نہیں ہو؟“

لڑکی واقعی انسان نہیں تھی۔ اس کا سارا جسم بہت خوبصورت اور سڈول تھا۔ اس کا آدھا چہرہ بے حد حسین تھا لیکن باقی آدھا چہرہ!!!! اس آدھے چہرے کو دیکھ کر دلپ کے سارے جسم میں خوف کی لہرں پھیل گئیں۔

لڑکی کا آدھا چہرہ کسی عورت کا چہرہ تھا جس نے کئی صدیاں دیکھی ہوں۔ آدھا چہرے پر جھریوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ آدھے ہونٹ سوکھے ہوئے خشک تھے۔ آدھے چہرے پر جو ابرو تھی، روئی کے گالے کی طرح سفید تھی لیکن آدھا چہرہ بالکل تروتازہ، شاداب و نوجوان تھا۔

لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے پھیلا کر کہا۔

”ہاں میں وہی ہوں جس کی تلاش میں تم آئے تھے۔ مجھے بھی تمہاری تلاش تم تم مجھے نئی زندگی دے سکتے ہو۔ مجھے تمہارے خون کی ضرورت ہے۔ صرف تھوڑا سا اور پھر میں مکمل ہو جاؤں گی۔ بالکل مکمل اور امر۔“

یہ الفاظ ختم ہوتے ہی دلپ کو ایک ایسا منظر نظر آیا کہ خوف سے اس کے میں دوڑتا خون جم گیا۔

اسے ایسا لگا جیسے وہ پتھر ہو گیا ہو۔ جیسے وہ اپنے ہاتھ نہ ہلا سکتا ہو۔

اچانک لڑکی کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کے ناخن بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔

دس ناخن، دس نیزوں کی طرح اس کی گردن کی طرف بڑھ رہے تھے۔

دلپ کو فوراً انسپکٹر جو گپال کی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا۔

”مرنے والے کی گردن پر دس سوراخ تھے۔“

دس ناخن، دس سوراخ۔ اس کے دماغ نے کہا۔ ”بھاگ یہاں سے دور۔“

موت لازمی ہے۔“ لیکن اس کے اعضاء نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

پہنانے لگی اور اس روشنی کے ساتھ محل پھر اسی طرح سجا ہوا نظر آنے لگا۔ لڑکی اسی جگہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

دلیپ کے اندر بھی ایک طوفان آیا ہوا تھا وہ سوچنے لگا۔

”یہ لڑکی جادوگرنی ہے یا بھوت ہے جو بھی ہے اس میں مافوق الفطرت طاقت ہے۔ وہ لڑکی ہے جو اب تک گیارہ انسانوں کا خون پی چکی ہے اور اگر آج اس کو ختم نہ کیا جاتا تو ابھی اور نہ جانے کتنے بے گناہ انسانوں کی جان جائے گی۔ اس کو ختم کرنا ہی ہوگا۔ ہر تپڑے چاہے مجھے اپنی جان کی بازی لگانا پڑے۔“

اور اب دلیپ یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ وہ اس وقت تک زندہ کیوں تھا۔ اصولاً اس کو ہائوٹ پر گر کر مرجانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پھر بھی اس وقت جب اس لڑکی کے ان اس کی طرف بڑھ رہے تھے، جب وہ بالکل برہنہ کھڑا تھا اس وقت اسے مرجانا چاہئے لیکن وہ پھر بھی زندہ تھا۔

وہ جان چکا تھا کہ وہ صرف اس انگوٹھی کی وجہ سے زندہ ہے جو چاند شاہ نے اپنی لپ میں کچھ دیر رکھ کر اس کو واپس کر دی تھی۔ اسے چاند شاہ کے الفاظ یاد آئے۔

وہ نے کہا تھا۔

”لو، اس کو پہن لو اور جاؤ لیکن یاد رکھنا کہ خدا کے حکم کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں مانتی۔“

اس جملہ کا مطلب وہ اس وقت بھی نہیں سمجھ سکا تھا اور اب بھی نہیں سمجھ پا رہا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس وقت اس کو زندہ رکھنے والی یہی انگوٹھی تھی۔ اسی انگوٹھی کی وجہ سے وہ لڑکی اس کے جسم کو نہیں چھو پا رہی تھی۔

اچانک لڑکی کی آواز نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔

”لو، کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟“

”تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتی ہو؟“ دلیپ نے پوچھا۔

”یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے وعدہ کرو۔“

”میں تمہیں گولی مار کر ختم کر سکتا ہوں۔“

گے۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔“

”اور اگر میں وعدہ نہ کروں تو؟“

”تو کچھ نہیں۔ میں جانتی ہوں میں تمہیں چھو نہیں سکتی۔ میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی لیکن اگر تم وعدہ نہیں کرو گے تو میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی اور یہاں جو کچھ تم نے دیکھا ہے اگر تم واپس جا کر کسی کو بتاؤ گے تو کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا کیونکہ اس وقت جو کچھ تم دیکھ رہے ہو وہ سب میری قوت کا کرشمہ ہے ورنہ اصل کچھ اور ہے۔“

”اصل کیا ہے؟“ دلیپ نے سوال کیا۔ اب وہ کپڑے پہن چکا تھا۔

”اصل؟ اصل دیکھنا چاہتے ہو؟“ یہ کہہ کر لڑکی نے اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ اچانک باہر بڑے زور سے بجلی کڑکی۔ اندر ایک دم اندھیرا چھا گیا۔ کہیں روشنی نہ رہی تھی۔ اس اندھیرے میں کسی طرف سے لڑکی کی آواز آئی۔

”تمہارے پاس گاڑی میں ٹارچ ہے۔ اب تم ٹارچ لا کر دیکھ سکتے ہو کہ اصل کیا ہے؟“

اس اندھیرے میں باہر جانا بھی آسان کام نہ تھا۔ اتفاق سے اسی وقت بجلی زور سے چمکی۔ اس ایک لمحہ کی چمک میں دلیپ نے جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر ایک بار پھر دہشت کی لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ چند سیکنڈ پہلے جو مکان قالینوں، جھاڑ فائوسوں، تصویروں اور فرنیچر سے بھرا ہوا تھا آن کی آن میں خالی رہ گیا تھا بلکہ اس کی دیواریں پلاسٹر سے ادھڑی پڑی تھیں، چھتوں پر جالے پھیلے ہوئے تھے۔ فرش پر اینٹیں اور پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹے ہوئے تھے۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے ہزار سال سے یہ مکان ویران پڑا ہے۔

بجلی پھر چمکی..... پھر چمکی اور ہر بار اسے وہی ویران منظر نظر آیا۔

کچھ دیر بعد لڑکی کی آواز پھر اندھیرے میں کسی طرف سے آئی۔

”دیکھ لیا تم نے..... اب میں پھر تمہارے سامنے آتی ہوں۔“

باہر بجلی کی کڑک ہوئی لیکن روشنی اندر نہ آئی۔ اندھیرے میں ایک مدہم روشنی

دلپ کو اس کی باتوں پر یقین نہیں تھا۔ وہ صرف ایک بات سوچ رہا تھا۔  
 ”یہ لڑکی انسان نہیں کوئی مافوق الفطرت چیز ہے۔ اس کا ختم ہونا ضروری ہے۔ اس  
 کو ختم کرنا ہی ہو گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنی جان کی بازی لگانا پڑے۔“  
 اس کو ختم کرنے کی ایک تجویز اس کے ذہن میں آئی تھی اس لیے اس نے جواب  
 دیا۔

”آل رائٹ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ اب تم پہلے  
 مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تم کون ہو یا کیا ہو؟ اس کے بعد بتاؤ کہ تم مجھ سے کس قسم کی مدد  
 چاہتی ہو؟“  
 لڑکی نے اطمینان سے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”اب تم اپنا وعدہ نہیں توڑ  
 سکتے۔“

”نہیں۔ میں اپنا وعدہ نہیں توڑوں گا۔“  
 ”تو سنو۔ یہ مکان جس میں تم کھڑے ہو دو سو سال سے ویران پڑا ہے۔ دو سو سال  
 پہلے میں اس مکان میں پیدا ہوئی تھی۔“  
 دلپ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”دو سو سال پہلے!“

”ہاں۔ دو سو سال پہلے۔ میرا نام راجکمار چندر روتی تھا۔ میں راجہ ترہون راج  
 کی بیٹی تھی۔ میں اتنی خوبصورت تھی کہ دور اور پاس کے علاقوں میں میری خوبصورتی کے  
 چرچے تھے۔ بڑے بڑے راج کمار مجھ سے شادی کے خواہشمند تھے۔ مگر میرے ذہن میں  
 ہمیشہ ایک بات رہتی تھی۔ میں سوچتی میری یہ خوبصورتی فانی ہے۔ چند سال بعد یہ حسن  
 زہل جائے گا، میرے چہرے پر جھریاں پڑ جائیں گی، سیاہ چمکیلے بال سفید ہو جائیں گے۔  
 آنکھوں کی چمک ماند پڑ جائے گی۔ میں اس دن سے ڈرتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ کسی  
 طرح میری خوبصورتی امر ہو جائے۔ میں سدا اسی طرح رہوں۔“

”چنانچہ میں نے اعلان کرا دیا کہ میں اس سے شادی کروں گی جو مجھے امر بنا دے  
 گا۔“

”لیکن کوئی مجھے امر نہ بنا سکا اور میں انتظار میں بوڑھی ہوتی چلی گئی۔ میں نے اس

”تم کو شش کر سکتے ہو۔“  
 ”تم میرے ریا اور سے خوفزدہ نہیں ہو؟“ دلپ نے پوچھا۔  
 ”مجھے کوئی نہیں مار سکتا۔“  
 ”لیکن ابھی تم کہہ چکی ہو کہ تم بھوت نہیں ہو۔ تمہارا جسم ٹھوس ہے اور ٹھوس  
 جسموں کو ریا اور کی گولی ختم کر سکتی ہے۔“  
 ”تمہاری گولیاں بھی مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ تم گولی چلا کر دیکھ سکتے ہو۔“  
 گولی چلانے میں حرج نہیں تھا۔ دلپ نے اس کے سینے کا نشانہ لے کر گولی  
 دی۔ دھماکے کی بازگشت دیر تک دیواروں سے ٹکراتی رہی۔ اس کی گولی لڑکی کے سینے  
 لگی تھی اور سینے سے پار ہو کر گزر گئی تھی۔

لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ ”دیکھ لیا تم نے۔ تم مجھے قتل نہیں کر سکتے۔“  
 ”پھر تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ تم بھوت ہو۔ تمہارا جسم ٹھوس نہیں۔“  
 ”میں بھوت نہیں اور میرا جسم واقعی ٹھوس ہے۔“  
 ”پھر تم پر گولی کا اثر کیوں نہیں ہوا؟“

”یہ راز بھی میں تب ہی بتاؤں گی جب تم میری مدد کرنے کا وعدہ کر لو گے۔“  
 ”اچھا یہ بتاؤ۔ کیا تم وہی لڑکی ہو جو اب تک سرپا موڑ پر گیارہ انسانوں کو ختم  
 چکی ہے؟“

”ہاں میں وہی ہوں۔ لیکن میں تمہیں ختم نہیں کر سکی اور وعدہ کرتی ہوں  
 تمہیں نہیں ماروں گی۔ تم میری مدد کرو۔ میں تمہیں اس کے بدلے میں وہ چیز دے  
 جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“  
 ”کیا؟“ دلپ نے پوچھا۔

”آب حیات۔ دوامی زندگی۔ تم میری مدد کرو تمہاری مدد سے میں امر بن سکتی  
 اور میں امر ہونے کے بعد تمہیں امر بنا سکتی ہوں۔ اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے  
 دونوں ایک دوسرے کے بن کر رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد تم میرا یہ خوبصورت جسم  
 ہمیشہ کے لیے حاصل کر سکتے ہو۔“

اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔ ان دس آدمیوں کا خون پی کر مجھ میں اتنی شکتی آگئی تھی کہ میں بغیر کچھ کھائے پئے پانچ سو سال تک زندہ رہی، لیکن وقت کا اثر نہیں روک سکی۔

”پانچ سو سال میں اس پنجرے میں زندگ لگتا رہا اور آخر اس کی دو سلاخیں ٹوٹ گئیں۔ تب میں اس قید سے چھوٹی ہوں۔ اب مجھ میں اتنی قوت اور خوبصورتی نہیں رہی کہ میں نوجوان مردوں کو پھانس کر ان کا خون پی سکوں۔ میری موت اب زیادہ دور نہیں، اس لیے مرنے سے پہلے میں تمہیں وہ منتر بتا جاتی ہوں اس سے تم امرین سکو گی۔

”اس بڑھیا نے مجھے وہ منتر بتایا اور مر گئی۔ میں نے امر بننے کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن میرے ساتھ بھی وہی ہوا جو اس بڑھیا کے ساتھ ہوا تھا۔ دو سو سال پہلے میں آٹھ مردوں کا خون پی چکی تھی۔ بد قسمتی سے ان میں سے ایک نوجوان کسی بہت بڑے رشی کا بیٹا تھا۔ وہ رشی مجھے مار نہیں سکتا تھا، مگر اس نے مجھے شراب دے کر دو سو سال کے لیے بے ہوش کر دیا۔ چنانچہ دو سو سال بعد میں اب جاگی ہوں اور اس سال میں پھر سے گیارہ انسانوں کا گیارہ دوج کی راتوں میں خون پی چکی ہوں۔ صرف ایک انسان کے خون کی ضرورت اور ہے اور آج دوج کی رات ہے۔ امر بننے کے لیے مجھے تمہارا پورا خون پینے کی ضرورت نہیں۔ صرف دو چلو خون بھی مل جائے گا تو میرے چہرے کا یہ باقی حصہ بھی جوان ہو جائے گا اور پھر میں امر ہو جاؤں گی۔ امر ہونے کے بعد میں تمہیں بھی امر بنا دوں گی۔ اس کے بعد ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ تم دو چلو خون سے مر نہیں سکو گے۔“

دلپ یہ کہانی سن کر حیران رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کہانی پر یقین کرے یا نہ کرے لیکن اب تک جو کچھ وہ دیکھ چکا تھا اس کو جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

”اچھی بات ہے۔ میں چاقو سے اپنی ایک رگ کاٹ کر تمہیں خون دے دیتا ہوں۔“

”نہیں اس طرح نہیں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”خون مجھے خود نکالنا ہوگا۔ منتر پڑھنا ہوگا۔ تم مجھے اپنے پاس آنے دو۔ اپنے آپ کو چھونے دو۔ بس ذرا سی دیر کی بات ہے۔

کھوج میں اپنی جوانی ختم کر دی۔ میرا جسم سکڑنے لگا۔ میرے چہرے پر جھریاں پڑنے لگیں۔ جس کا نمونہ تم یہاں میرے چہرے پر دیکھ سکتے ہو۔

”جب میری یہ حالت ہو گئی تو ایک روز ایک بہت بوڑھی عورت میرے پاس آئی۔ اس کا چہرہ مجھ سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔ اس نے اپنی عمر پانچ سو سال بتائی۔ وہ سرپا موڑ کے نیچے اس کھڈ میں رہتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے ہمیشہ جوان اور زندہ رہنے کا راز بتا سکتی ہے وہ خود بھی میری طرح امر بننا چاہتی تھی۔ اس نے بتایا کہ پانچ سو سال پہلے ایک شخص نے اسے بتایا تھا کہ اگر دوج کی رات کو میں کسی نوجوان مرد کا خون پیوں اور اس طرح ہر مینے خون پیتی رہوں یا کم از کم بارہ مردوں کا خون میں پی لوں تو میں امر ہو سکتی ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مرد نوجوان ہو اور دوج کی رات ہی کو اس کا خون پیا جائے۔“

”اس بڑھیا نے بتایا کہ میں دس مردوں کو اپنے خوبصورت جسم کا لالچ دے کر سرپا موڑ کے اس غار میں لے گئی اور ان کو مار کر ان کا خون پی لیا۔ لیکن گیارہواں مرد چلاک نکلا اسے پہلے سے کچھ شک ہو گیا تھا۔ میں اس کو بہکا کر اپنے ساتھ نیچے غار میں لے گئی تو اس نے میرے سر پر پتھر مار کر مجھے بے ہوش کر دیا۔ اس رات میں خون نہ پی سکی۔ اس کے بعد اس شخص نے مجھے وہیں قید کر دیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ پہلے جن دس آدمیوں کا خون میں نے پیا تھا ان میں سے ایک اس کا بھائی تھا۔ وہ اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے ہی آیا تھا۔ اس نے لوہے کا ایک بہت بڑا پنجرہ بنوایا تھا جس میں مجھے قید رکھ سکے۔ اس رات مجھے بے ہوش کر کے اس نے مجھے اس پنجرے میں قید کر دیا اور پنجرے کو غار کے اندر چھپا کر چلا گیا۔“

”مجھے ان مردوں کا خون پیتے ہوئے ایک منتر بھی پڑھنا ہوتا تھا۔ دس آدمیوں کا خون پینے سے میں امر تو نہ ہو سکی، لیکن میری عمر بڑھ گئی۔ جس شخص نے مجھے یہ منتر بتایا تھا اس نے کہا تھا کہ اگر کسی مرد کا خون پینے کے بعد پورا سال گزر جائے گا تو بچھلی ساری تمپیا ختم ہو جائے گی اور امر بننے کے لیے پھر نئے سرے سے کوشش کرنی ہوگی۔ صرف دو انسانوں کے خون کی کمی رہ گئی تھی کہ وہ شخص مجھے لوہے کے پنجرے میں قید کر کے چلا گیا

کرنی یا بھوتی ہے جو پانچ سو سال تک اس غار میں قید رہ چکی ہے۔

”بس اب دس منٹ پورے ہو رہے ہیں۔ میں ڈائری بند کرتا ہوں۔ صبح کو یا تو خود آکر آپ کو سارے حالات بتاؤں گا ورنہ میری یہ ڈائری آپ کو سب کچھ بتا دے

”وہ لڑکی اب باہر آرہی ہے۔ اس لیے میں ڈائری بند کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے اپنی زندگی کی قربانی دینی پڑی تو بھی میں اپنے ساتھ ہی اس بلا کو ہمیشہ کے لیے ختم دوں گا۔“

اسی وقت وہ لڑکی باہر آگئی۔ دلپ نے ڈائری بند کر کے جیب میں رکھ لی۔ اس نے دلپ نے دیکھا کہ لڑکی کے چہرے کا وہ بوڑھا حصہ غائب ہو چکا ہے۔ اس نے کہا۔

”تمہارا چہرہ تو ٹھیک ہو گیا؟“

”یہ عارضی ہے۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”اپنی شکتی سے تھوڑی بہت دیر کے لیے اس حصہ کو بھی خوبصورت بنا سکتی ہوں لیکن پھر وہ اپنی اصلی حالت پر واپس آجاتا۔ تمہارا دو چلو خون ملنے پر یہ ہمیشہ کے لیے اسی طرح بن جائے گا۔“

دلپ نے اپنے برابر والی سیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہاں آ جاؤ۔“

”میں تمہارے پاس نہیں بیٹھ سکتی۔ پہلے تم وہ انگوٹھی اتار دو۔“

دلپ نے انگوٹھی اتار کر سامنے ڈیش بورڈ پر رکھ دی اور کہا۔ ”لو اب آ جاؤ۔“

”ہاں اب ٹھیک ہے۔“

یہ کہہ کر لڑکی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس نے گاڑی اشارت کر لیا اسے یقین تھا کہ لڑکی اس پر فوراً حملہ نہیں کرے گی۔ انگوٹھی اس نے ڈیش بورڈ پر لٹائے رکھی تھی کہ وہ اس کے ناخن بڑھتے دیکھے گا تو فوراً انگوٹھی اٹھالے گا۔

راستہ بھر دونوں خاموش رہے۔ آخر سرپا موڑ آگیا۔ دلپ کا دل دھک دھک اٹنے لگا۔ موڑ کے قریب پہنچ کر اس نے اسٹیرنگ ایک ہاتھ سے سنبھالا اور دوسرا ہاتھ ڈش بورڈ پر انگوٹھی کے پاس رکھ دیا۔

”اب..... بس اب وقت آگیا ہے۔“ لڑکی نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

اس کے بعد ہم دونوں امر ہو جائیں گے۔“

”اچھا۔“ دلپ بولا۔ ”تم میرے پاس آ جاؤ اور میرا خون لے لو۔“

”نہیں۔ میں تین بار کوشش کر چکی ہوں۔ تمہارے اندر کوئی ایسی قوت ہے یا تمہارے جسم پر کوئی ایسی چیز ہے جو مجھے تمہارا جسم چھونے نہیں دیتی۔“

دلپ نے ہاتھ بڑھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہاں یہ انگوٹھی ہے جو تمہیں مجھے چھونے سے روکتی ہے۔ یہ میری حفاظت کر رہی ہے۔“

”تو اس کو اتار دو۔ یہ انگوٹھی اتار کر تمہیں میرے ساتھ سرپا موڑ پر ہی چلنا ہو گا۔“

دلپ کے ذہن میں اس ڈائن کو ختم کرنے کی ایک تجویز آگئی تھی۔ اس نے کہا۔

”اچھی بات ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے تو اس کو ضرور پورا کروں گا۔ میں تمہارے ساتھ سرپا موڑ پر چلنے کو تیار ہوں۔ انگوٹھی میں اتار دوں گا لیکن ایسا کرنے سے پہلے میں سوچنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی گاڑی میں واپس جاتا ہوں۔ دس منٹ سوچتا ہوں۔ اس کے بعد تم آ جانا۔ میں تمہاری ہر بات مان لوں گا۔“

”پکا وعدہ؟“ لڑکی نے کہا۔

”ہاں پکا وعدہ۔“

”اچھی بات ہے۔ تم جاؤ۔ میں دس منٹ بعد آ جاؤں گی۔“

دلپ باہر آگیا۔ باہر ابھی تک بارش ہو رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے ٹارچ نکال کر روشن کی۔ جیب سے اپنی ڈائری نکالی اور قلم نکال کر لکھنے لگا۔

جو کچھ واقعات اس کے ساتھ گزرے تھے سب کچھ تفصیل سے لکھ کر اس نے آخر میں لکھا۔

”انسپیکٹر جوگپال صاحب! اگر آپ کو میری لاش سرپا موڑ کے اسی کھڈ میں ملے تو سمجھ لیجئے کہ آج کے بعد یہ ڈائن کسی انسان کو ختم نہیں کر سکے گی۔ میں مرنے سے پہلے ایسا بندوبست کر جاؤں گا کہ میرے ساتھ ہی یہ بھی ختم ہو جائے گی۔ میں جانتا ہوں اس نے مجھے جو کہانی سنائی ہے وہ آدمی سچ ہے، آدمی جھوٹ ہے۔ میرا خیال ہے یہ وہی

## خون پینے والا

نومبر ۱۹۳۹ء کی سب سے خفیاں اور خفیاں رات کو ادھیڑ عمر کا ایک جرمن ڈسٹریکٹ کے ہوف گاؤں میں بڑی ممانت اور دھیمی چال کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی چلتے چلتے ایک آدھ لٹے کے لیے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے باغ کے ویران گوشوں پر نظر ڈالتا اور آگے بڑھ جاتا۔ وہ نرم آنکھوں اور دبلے پتلے جسم والا آدمی تھا۔ اس نے اپنے دبلے پتلے جسم کو اور کوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ اور کوٹ کے بٹن کھلے تھے مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک آبدار شکاری چاقو تھا۔ اپنی چال ڈھال سے وہ آدمی نرم خواہر مدبر نظر آتا تھا۔

آدمی رات گزر گئی۔ باغ ویران ہو گیا۔ وہ آدمی بھی ادھر ادھر گھومتا ہوا تھک چکا

سرا موڑ پر جیسے ہی گاڑی پہنچی۔ دلیپ نے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ لڑکی نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور اس کے ناخن بڑھنا شروع ہو گئے۔ ناخن آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے اس کی گردن کی طرف آرہے تھے۔

گاڑی سرا موڑ پر پہنچی۔

پھر جیسے ہی لڑکی کے بڑھے ہوئے ناخن اس کے بدن کو چھونے والے تھے دلیپ نے اٹھ اٹھیرنگ چھوڑ کر دو حرکتیں کی۔ ایک ہاتھ سے اس نے انگوٹھی کو مٹھی میں پکڑ لیا اور دوسرا ہاتھ پھرتی سے لڑکی کے ہاتھوں پر ڈال دیا۔

اچانک لڑکی کے حلق سے ایک تیز دردناک چیخ نکلی۔

اس کے ساتھ ہی گاڑی سرا موڑ کے جنگل سے نکل کر اچھلی اور فضا میں قلاباز کھاتی ہوئی کھڈ میں جا گری۔

بجلی بڑے زور سے کڑکی۔ اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔

○☆○

صبح ہوتے ہی انسپکٹر جو گپال دلیپ کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔

آخر اسے دلیپ گنگولی کی گاڑی کھڈ میں مل گئی۔

دلیپ مرچکا تھا مگر اس کی گردن پر کسی طرح کا نشان نہیں تھا۔ البتہ اس کے براہ والی کوٹ پر راکھ کا ذرا سا ڈھیر پڑا تھا اور کچھ نہیں تھا۔ دلیپ نے وہ انگوٹھی اپنی مٹھی اس وقت بھی پکڑی ہوئی تھی۔

اس بارہویں موت کے بعد سرا موڑ پر پھر کبھی کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

○☆○



ایک مدت تک جرمنی کی پولیس کے اعلیٰ حکام اور زیرک سراغ رساں یہ سمجھتے رہے کہ یہ وارداتیں چار مجرموں کے کارنامے ہیں حالانکہ ان تمام وارداتوں کا ذمہ دار صرف اور صرف ایک ہی شخص تھا۔

نوفمبر ۱۹۲۹ء کو دو بچے موٹی اور فرانس، بہن بھائی سکول سے چھٹی کے بعد سکول کی گراؤنڈ میں گیند بلا کھیل رہے تھے۔ دوپہر ڈھل رہی تھی، موٹی نے اپنے بھائی فرانس سے کہا، ”چلو آؤ گھر چلیں۔ دیر ہو رہی ہے۔“ عین اسی وقت ایک شریف صورت، نرم رادھیڑ عمر کا مدر آدمی کھیل کے میدان میں جنگلے کے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور دلچسپی کے ساتھ بہن بھائی کی تکرار کو سننے لگا۔ موٹی گھر جانے پر بضد تھی اور فرانس کچھ دیر تک کھیلنے، مصر، موٹی لڑتی جھگڑتی کتابیں اٹھا کر گھر کی طرف بھاگ گئی۔ فرانس اکیلا کھیلتا رہا۔ ادھیڑ رجرمن وہیں کھڑا رہا اور کبھی کبھی فرانس کے کھیل کی تعریف کر دیتا۔ شام کے سائے لہرے ہو رہے تھے کہ جب نرم خوادھیڑ عمر کے آدمی نے آگے بڑھ کر فرانس کو تھپکی دیتے دئے ایک ٹائی تھادی۔ فرانس نے شکریہ ادا کیا تو ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا، ”تم بہت اچھا لیتے ہو کبھی میں بھی تم جیسا تھا۔ آؤ تمہیں قریب سے مٹھائی لے دیں۔“ فرانس خوشی اٹھی اس کے ساتھ چل پڑا۔ اجنبی نے ننھے فرانس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ وہ انوں ایک تاریک گلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک ویران اور سنسان گھر کے سامنے جا کر ادھیڑ عمر آدمی نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ شکاری چاقو تاریکی میں چمک رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد فرانس کے گلے پر ہونٹ رکھے وہ اس کا خون پی رہا تھا۔

فرانس کے قتل کے دس دن کے بعد ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ پینتالیس سالہ بنگ شیزرات کے وقت گیراج کو ہند کر کے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ آج اس نے کچھ زیادہ ہی چڑھالی تھی۔ اس لیے اس کے قدم ڈول رہے تھے۔ ابھی وہ چند قدم گئے ہی بڑھا تھا کہ کسی نے آگے آکر بڑے مذہبانہ لہجے میں کہا، ”جناب میں آپ کو مارا دے کر گھر تک پہنچاؤں؟“ شیز نے نشے سے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اپنے ارد کی طرف دیکھا اور کوئی جواب دینے بغیر آگے بڑھ گیا۔ چند قدم آگے جا کر وہ لڑکھڑایا لگی میں گر پڑا۔ اس کے گرنے کی دیر تھی کہ مدہم چال چلتے والا ادھیڑ عمر کا آدمی عقاب

تھا۔ وہ اپنے تھکے قدموں کے ساتھ جھیل کی طرف یوں بڑھنے لگا جیسے بہت مایوس ہو۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھا بھی رہا تھا۔ ”آج کوئی شکار ہاتھ نہیں لگا۔ اکیلے اکیلے مرد اور لڑکیاں کہاں چلی گئیں۔“ اس کے پتلے اور باریک لب خشک ہو رہے تھے جیسے وہ شدت کی پیاس سے پھنک رہا ہو۔ جھیل کے کنارے پانی میں بطنیں سو رہی تھیں۔ دبے قدموں کے ساتھ ادھیڑ عمر کا آدمی ایک بلخ پر نظرس جمائے کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس کی عجیب حالت تھی۔ جسم کانپ رہا تھا۔ دل پھلیاں توڑ کر سینے سے باہر نکلتا چاہتا تھا اور پاؤں کی ایڑیاں جل رہی تھیں۔

وہ نرم خوادھیڑ عمر جرمن ٹھنڈے پانی میں اترنے لگا۔ اس نے جھپٹ کر ایک بلخ کو پکڑ لیا۔ بلخ اپنا آپ چھڑانے کے لیے پھڑپھڑائی، جینی پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز گھٹ گئی۔ ادھیڑ عمر آدمی نے اپنے ہاتھوں سے اس کی گردن مروڑ دی۔ پھر گھٹنوں کے بل جھک کر اس نے ٹھنڈی زمین پر بلخ کو رکھا اور اس کا سر اڑا دیا اور اپنے ہونٹ بلخ کے گلے پر رکھ دیئے جہاں سے خون ابل رہا تھا۔ وہ غناغٹ خون پینے لگا۔

یہ دنیا کا عجیب و غریب قاتل تھا۔ یہ انسان اپنے شکار کے زخم پر منہ رکھ کر اس کا سارا خون پی لیا کرتا تھا۔ ۱۹۲۰ء سے ایسی وارداتیں جرمنی کے ایک شہر ڈسل ڈورف میں مسلسل ہوتی جا رہی تھیں۔ آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس کے شکاروں کی تعداد کیا تھی۔ مگر یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس نے بیسیوں افراد کا خون اسی طرح پیا تھا۔

اس عجیب و غریب گمنام قاتل کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ اخباروں نے اسے عجیب عجیب نام دیئے تھے۔ ڈسل ڈورف کا بھینڑا، خون چوسنے والا قاتل، دیہائز، درندہ وغیرہ۔ وہ اکتیس سالوں تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ پولیس کو صرف انتالیس وارداتوں کی خبر ہو سکی۔ اس نے مردوں، عورتوں، بچوں کو اپنا نشانہ بنایا۔ اس نے چاقو سے، قینچی سے، خنجر سے لوگوں کو ہلاک کیا اور ان کا خون پیا۔ اس کے باوجود اس پر دو چیزوں کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ اپنے شکار کو زندہ یا مردہ حالت میں بے آبرو کرنے کا اور آدم خوری کا۔ وہ انسانوں کو صرف اسی لیے قتل کرتا تھا کہ ان کے خون سے اپنی پیاس بجھا سکے۔

کی طرح اس پر جھپٹا۔ تیز چمکدار چاقو اندھیرے میں لہرایا اور پھر وہ آدمی جھک کر اپنے شکار کے زخموں پر ہونٹ رکھ کے خون چوس رہا تھا۔  
اگلے دن جب پولیس نے لاش کا معائنہ کیا تو جسم پر بیس گھاؤ تھے اور ہر گھاؤ نیلے نشان تھے۔ کسی کے ہونٹوں کے!

بیس جولائی ۱۹۲۹ء کی رات کو بیستیس سالہ کبھی ایما گراس گھومتی گھامتی واکر گارڈن پہنچی۔ وہ بڑی تھکی ہوئی تھی اس لیے باغ کے ایک بیج پر لیٹ گئی۔ یہ ایک گرم رات تھی۔ اس لیے اس نے اپنے بالائی لباس کے بٹن کھول دیئے۔ عین اس وقت اس نے قدموں کی آواز سنی اور پھر کسی نے بڑے مہذب لہجے میں کہا۔ ”شب بخیر فراؤ لین۔“ وہ چونکی۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ آج شام مصروف نہیں ہیں۔ آئیے میرے ساتھ۔“ ایما اس مہذب انسان سے بہت متاثر ہوئی اور پھر وہ دونوں معاملات چکا کر ایما کے گھر کی طرف چل پڑے۔ مشروبات سے فارغ ہو کر مہذب اجنبی ایما پر جھکا۔ اس کے ہونٹ ایما کے شفاف گلے کو چھو رہے تھے۔ ایما نے یوں محسوس کیا جیسے اس کے گلے میں کوئی سخت چیز چھب رہی ہو۔ اس نے اپنا سر جھٹکا۔ اجنبی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ایما کانپ اٹھی۔ اجنبی کے ہونٹ خون سے سرخ تھے۔ اس کے اپنے خون سے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے چیختی، اجنبی کے ہاتھوں نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔

اگلی صبح پولیس کو ایما مردہ حالت میں اپنے کمرے میں ملی۔ گلے میں بڑا سا زخم اور اس کا سارا خون نچڑا ہوا تھا۔

اکیس اگست ۱۹۲۹ء کو کارنیوال میں کام کرنے والا ایک لڑکی آنا کے ساتھ بھی واقعہ پیش آیا۔ چوبیس اگست ۱۹۲۹ء کو ہلڈا اور گریڈا مردہ پائی گئیں۔ دونوں کے جسم سے سارا خون چوس لیا گیا تھا۔

برلن سے جاسوسوں کی جماعت ڈسل ڈورف پہنچ گئی۔ ڈسل ڈورف کے انوکھے قاتل کی تلاش میں ایک ایک، ایک ایک، بازار اور ہر ایک خفیہ ٹھکانہ چھانا گیا۔ پولیس کے افسروں اور جہاندیدہ سراغ رسانیوں نے فیصلہ کیا کہ قاتل ایک آدمی بلکہ چار ہیں مگر انتھک جدوجہد اور کوشش کے باوجود ایک قاتل بھی گرفتار نہ کیا جاسکا۔

چودہ مئی ۱۹۳۰ء کو جب ڈسل ڈورف کے ریلوے اسٹیشن پر کالون سے آنے والی لڑکی تو دوسری سواریوں کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی میرا بڈلک بھی گاڑی سے اتر کر فارم پر کھڑی ہو گئی۔ بچاری بہت گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ اتنے بڑے شہر میں بار نوکری کی تلاش میں آئی تھی اور جس آدمی نے اسے نوکری دلوانے کا وعدہ کیا تھا بٹ فارم پر کہیں بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ رات کہاں بسر کرے گی اتنے بڑے شہر میں اس انسان کو کس طرح تلاش کرے گی جو اس کے مستقبل کا ن تھا۔ وہ انہی خیالات میں پریشان اور کھوئی ہوئی تھی کہ ایک نرم خو، مہذب ادھیڑ آدمی متانت کے ساتھ چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور بولا۔ ”میں آپ کے کسی کام آ ہوں۔“ بچاری بوکھلائی ہوئی لڑکی نے ایک ہی سانس میں اپنی پتلا سادی۔ ادھیڑ عمر کے نے اسے تسلی دی اور کہنے لگا۔

”آپ میرے ساتھ چلیے۔ میں آپ کو اپنے گھر لئے چلتا ہوں۔ وہاں گرم کھانا ہے۔ اس کے بعد میں آپ کو کسی سستے اور معقول ہوٹل میں لے چلوں گا اور صبح پر کچھ سوچا جائے گا۔ رات آپ وہاں اطمینان سے کاٹیں۔“

لڑکی نے ادھیڑ عمر آدمی کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ مرد اسے اپنے لے گیا۔ جہاں اس نے اسے گرم دودھ کے ساتھ ڈبل روٹی کھلائی اور پھر بولا۔ ”چلو تمہیں کسی ہوٹل میں چھوڑ آؤں۔“

اجنبی اسے کسی ہوٹل میں لے جانے کی بجائے گرمین برگ کے جنگل میں لے کر لڑکی کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اس کی گردن میں دانت پیوست کر دیئے۔ نوجوان محنت مند لڑکی نے اس کی بانہوں کا شکنجہ توڑ دیا اور اندھا دھند بھاگتی ہوئی اس کی ما سے باہر چلی گئی۔

جب یہ لڑکی ڈسل ڈورف میں کام تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی اور اس نے لکھا بھی معقول انتظام کر لیا تو اس نے اپنی ایک سہیلی کو ایک خط میں یہ سارا واقعہ بھیجا۔ جرم بہر حال افشا ہو کر رہتا ہے اور یہاں بھی ایک عجیب انداز سے جرم افشا ہو گئی۔ سہیلی نے اپنی سہیلی کے نام کے بچے کو لکھے اور خط اس کی سہیلی کی

## آدم خور کا کروچ

”شیڈو“ اپنی طرز کا واحد میگزین تھا اگرچہ اس میگزین کے سال میں صرف دو ہی پرچے بازار میں آتے تھے لیکن وہ ہاتھوں ہاتھ بک جاتا تھا۔ بیشتر قارئین اس کے چھپنے والے مواد میں سب سے پہلے سام بریڈی کی خوفناک کہانی کو پڑھنا پسند کرتے تھے۔ دوسرے معنوں میں یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ سام بریڈی کا نام ہی اس میگزین کی مقبولیت کا سبب تھا۔ اس کی لکھی ہوئی خوفناک کہانی تھیر اور دہشت ناک مناظر سے بھرپور ہوتی تھی اور پڑھنے والا سوچ میں گم ہو جاتا تھا کہ کیا ایسا ممکن ہے؟ سام ہمیشہ ویران ٹولپوں، ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات اور ماورائی بستیوں کو اپنی کہانی کا پس منظر بنا کر پلاٹ کاٹتا بلاتا تھا۔

بجائے ایک دوسری عورت کو ڈاک میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ ایک سمجھدار عورت تھی جو ڈسٹرکٹ ڈورف کے بھیڑیے کے خوفناک کارناموں کو پڑھ سن چکی تھی۔ اس لیے اس نے یہ خط پولیس کے حوالے کر دیا۔

چوبیس گھنٹوں کے بعد پولیس میرا کے دروازے کو کھٹکھٹا رہی تھی۔ اس نے بڑے اعتماد سے پولیس کو بتایا کہ وہ انہیں اس آدمی کے گھر لے کر جاسکتی ہے جو اسے جنگل میں لے گیا تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس پولیس کے کارندے میرا کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ میرا انہیں ٹھیک منزل پر لے گئی۔ پولیس نے مکان کی مالکن سے کرایہ دار کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا۔ ”یہاں پیٹر کرٹن رہتا ہے۔ اپنی بیوی کے ساتھ۔ بڑا شریف آدمی ہے۔“ چند لمحوں کے بعد ایک آدمی سیڑھیاں اتر کر بازار میں آیا۔ میرا نے اشارے سے پولیس کو بتایا کہ یہی وہ آدمی ہے۔

چند گھنٹوں کے بعد پولیس کے مسلح سپاہی پیٹر کرٹن کو نرغے میں لے چکے تھے۔ اس نے اپنی مشہور و معروف متانت اور تحمل مزاجی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، آپ لوگوں مجھ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“ پولیس کی حراست میں کرٹن نے اپنے جرائم کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کر لیا۔ اس نے بتایا کہ نوجوانی کے عالم میں اس تعلقات ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے ساتھ تھے۔ وہ عورت اذیت پسند تھی وہ خود بھی عادت کا شکار ہو گیا اور ایک واردات کے بعد دوسری واردات کرنے پر مجبور تھا۔ اپنے تمام جرائم کی جملہ تفصیلات یاد تھیں۔ طبی معائنے سے ثابت ہوا کہ وہ مجبوظ الحواس ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس انوکھے اور خون پینے والے قاتل نے اپنی بیوی پر ظلم نہیں کیا تھا اور اس کی بیوی اس کے تمام وحشیانہ جرائم سے قطعی لاعلم تھی۔

۲ جولائی ۱۹۳۱ء کو اسے پھانسی دے دی گئی۔

○☆☆○

یہ قبائل کے ساتھ گزر رہا ہے جو کالے علم پر یقین رکھتے ہیں۔ تھک ہار کر ڈپتھر نے اس سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ویسے بھی سام اپنی تحقیقات تو بذریعہ ڈاک بھیجتا ہی رہتا تھا۔ یہ دیگر بات تھی کہ اس کی تحریریں سال میں ایک دو بار ہی موصول ہوتی تھیں۔

سمندر کے ساحلی علاقے پر واقع قصبہ نویڈا پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ حالانکہ صبح کے نونچ چکے تھے لیکن کمر کی دبیز چادر چند گز آگے کے منظر کو دیکھنے میں حائل تھی۔ قصبے کے زیادہ تر مکانات پتھر اور چوٹے سے بنے ہوئے تھے اور ان پر موٹے موٹے درختوں کے تنے ڈال کر ڈھلوان شکل میں بنایا گیا تھا جن پر سرخ کھیریلیں بچھی ہوئی تھیں لیکن ب ان سرخ کھیریلوں کی رنگت فرسودگی کی وجہ سے سیاہ پڑ گئی تھی۔

ایسی ہی ایک سالنورہ عمارت کی بالکونی میں کھڑا ہوا سام بریڈی بیزار نگاہوں سے اس سامنے والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے کسی عورت اور مرد کے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سامنے والے مکان کی بالکونی اس سے دس بارہ فٹ ہی آگے تھی۔

دفعتاً ایک چلنے کا گنگ تیزی سے اس کی طرف آیا اگر سام فوراً ہی جھک نہ جاتا تو در و شور سے پھینکا ہوا گنگ اس کے منہ پر لگتا۔ سام کو اس فلیٹ میں آئے ہوئے دو دن بچکے تھے اور ان دونوں میں سامنے رہنے والے میاں بیوی میں یہ سترھواں جھگڑا تھا۔ ام نے محسوس کیا تھا کہ صبح سویرے سے یہ دونوں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتے تھے اور پھر سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا تھا۔

عام حالات میں کبھی اس بے ہودہ جوڑے کے پڑوس میں رہنا پسند نہیں کرتا لیکن جس کہانی پر کام کر رہا تھا میاں کا ماحول اس کے لئے بے حد متاثر کن تھا۔ یکایک اس سماعت سے فحش گالیوں کے علاوہ عورت کے چند جملے نکلائے۔

”ہارڈی! تیرا پڑا سا جسم کسی کام کا نہیں ہے؟ تجھ سے بہتر تو وہ نیگرو لڑکے ہیں جو بچوں سے مچھلی اتارتے ہیں۔“

دفعتاً ایک چٹاخ سے آواز آئی اور عورت کے بلکنے اور چیخنے میں مزید اضافہ ہو گیا پھر مرد کی بھاری آواز گونجی جس میں عورت کی خصوصیات بڑے عالمانہ انداز میں بیان

”شیڈو“ کے ایڈیٹر ڈپتھر نے لاکھ چاہا کہ سام ہر ماہ اسی قسم کی خوفناک کہانیاں لکھا کرے لیکن اس نے معذرت کر لی تھی کہ ایسی کہانیاں صرف سال میں ایک دو بار ہی لکھی جاسکتی ہیں کیونکہ ان کے لئے پس منظر کی تلاش بہت ضروری ہے۔ اسی لئے وہ کسی ایک شہر میں نہیں رہتا ہے بلکہ وہ مختلف قصبوں، شہروں میں گھومتا پھرتا ہے۔

ڈپتھر اس سے زیادہ واقف نہیں تھا بس ایک دن سام بریڈی کی ایک کہانی اسے ڈاک سے موصول ہوئی۔ کہانی پڑھنے کے بعد اس کے روٹے کھڑے ہو گئے اور اس نے تازہ شمارے میں اسی کو چھپا دیا۔ کہانی چھپنا تھی کہ دفتر میں مبارکباد کے خطوط کا ڈھیر لگ گیا اور پرچے کی اشاعت میں نمایاں اضافہ ہو گیا۔ ڈپتھر خط کے پتے پر خود پہنچا کہ سام کو مبارکباد بھی دے دے اور آئندہ کے لئے مزید کہانیاں لکھنے کا معاہدہ بھی کر لے لیکن جب وہ شہر کے مضافاتی علاقے کے ایک بوسیدہ مکان میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ سام بریڈی یہاں سے جا چکا ہے۔

تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد سام کا ایک خط ”شیڈو“ کے دفتر میں ڈپتھر کو موصول ہوا جس میں معاوضے کی ادائیگی کے لئے ایک دور دراز قصبے کے پوسٹ ماسٹر کا حوالہ دیا گیا تھا اور ساتھ ہی ایک نئی کہانی کا مسودہ بھی تھا۔ ڈپتھر نے فوراً ہی مقبول معاوضے کا چیک بنا کر اس تحریر شدہ پتے پر روانہ کر دیا اور ساتھ ہی اس سے استدعا کی کہ وہ یا تو دفتر آ کر اس سے مل لے یا پھر اپنا صحیح پتہ تحریر کرے تاکہ وہ خود وہاں جا کر اس سے ملاقات کر سکے۔

پھر ایک طویل عرصہ گزر گیا اور سام کا کوئی خط نہیں آیا اور نہ ہی کسی کہانی کا مسودہ۔

تین ماہ گزرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اچانک سام کا ایک خط ڈپتھر کو ملا اور ایک نئی کہانی کا مسودہ بھی۔ خط میں ملاقات نہ کرنے کی معذرت اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ وہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے کسی سے ملاقات نہیں کرتا ہے۔

ڈپتھر نے اس کے بعد بھی کئی بار اس سے ملاقات کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ رہا۔ وہ کبھی اپنی ہر لمحہ بدلنے والی رہائش گاہ پر اسے نہ مل سکا البتہ اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ افریقہ کے گھنے جنگلوں میں بعض

میرے شوہر کو ہارڈی! وہ ایک لانچ کا مالک ہے لیکن کمری وجہ سے آج کل گھری میں پڑا رہتا ہے۔“ آخری جملہ کہتے ہوئے اس نے برا سامنہ بنایا تھا۔

”خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ سام نے کہا۔ ”آپ لوگ بڑے ہی کم گو اور تنہائی پسند معلوم ہوتے ہیں۔“ مجھے تین دن ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے اور آج آپ سے تعارف ہو رہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

”ہاں! ہم لوگ ذرا تنہائی پسند واقع ہوئے ہیں مسٹر.....“ اس نے کہا اور خاموش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”معاف کیجئے مسز ہارڈی! میں نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔ مجھے سام بریڈی کہتے ہیں اور میں کہانیاں لکھتا ہوں۔“

”ہاں مسٹر سام! میں کہہ رہی تھی کہ ہم لوگ ذرا تنہائی پسند واقع ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے پڑوس میں کسی سے ملنا جلنا بھی نہیں ہے اور ویسے بھی ہم اپنی ذات سے کسی کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے۔“ یہ کہہ کر اینگڑ بالکونی کی ریلنگ پر جھک گئی۔

سام نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں اس کے لئے دعوت تھی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ اس کی آنکھوں میں گھورتی ہوئی بولی۔

”میرے شوہر ذرا جذباتی ہیں ممکن ہے کہ کبھی آپ نے ان کی آواز سنی ہو ورنہ میں تو ہمیشہ خاموش ہی رہتی ہوں۔ ویسے موسم کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر کچھ پینے کا خیال ہے تو آجاؤ۔ میرا شوہر اس وقت ساحلی بار میں اونڈھا پڑا ہو گا۔ تم چاہو تو دو چار گھنٹے بیٹے کمرے میں گزار سکتے ہو۔“ اینگڑ بے تکلفی پر اتر آئی۔

”شکریہ!“ سام نے برا سامنہ بنا کر جواب دیا۔ ”میں عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینا پسند نہیں کرتا۔“ اس کا لہجہ خاصی حد تک ناگوار ہو گیا تھا۔ پھر وہ مزید کچھ کہے بغیر مڑا اور اس نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر جھٹکے سے بالکونی کا دروازہ بند کر دیا۔

اینگڑ چند لمحے حیرانی سے اسے دیکھتی رہی پھر ایک فحش گلی دے کر پیر پختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے دو دن سام نے بڑی پریشانی میں گزارے۔ وہ اپنی کہانی کا ایک لفظ بھی نہیں

کی گئی تھیں۔

سام نے اکتاہٹ آمیز انداز میں انگڑائی لی اور مڑ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کے ایک کونے میں بوسیدہ سی میز پڑی تھی۔ اس کے برابر ہی ایک خالی کرسی تھی جس کی گدیاں پھٹ کر اپنی موجودہ حالت زار چیخ چیخ کر بیان کر رہی تھیں۔ سام خاموشی سے اس پر جا کر بیٹھ گیا اور دراز سے کاغذ نکال کر اپنے مسودے پر کام کرنے لگا لیکن اب عورت کی آواز مزید بلند ہو گئی تھی۔ وہ اپنی کہانی کے بارے میں کچھ سوچنا اور لکھنا چاہتا تھا مگر ان دونوں کی ملی جلی چنگھاڑتی ہوئی آوازیں مسلسل مغل ہو رہی تھیں۔ بالآخر سام بھنا کر کرسی سے اٹھ گیا اور اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

گذشتہ رات بھی وہ ان دونوں کی چیخ دھاڑ کی وجہ سے نہ تو کہانی کے مسودے پر کام کر سکا تھا اور نہ ہی پوری نیند سو سکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جلن سی ہو رہی تھی اور بدن میں ہلکا ہلکا سادرد بھی۔ حالانکہ وہ صبح تڑکے ہی اٹھ کر نہایا تھا۔

سام نے آنکھیں موند لیں اور پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ خواب میں بھی ان دونوں کو ہی لڑتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب اس سے ان کا جھگڑا دیکھنا نہ گیا تو وہ ان کے فلیٹ میں داخل ہوا اور ان سے مخاطب ہوا ہی تھا کہ مرد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔ ”اچھا تو یہ ہے تیرا نیا عاشق اور پھر اچانک ہی اس نے ایک ماکا سام کو رسید کیا اور پھر اچانک ہی سام کی آنکھ کھل گئی وہ اپنے بستر پر پڑا تھا۔ سورج خاصا نیچے ہو گیا تھا۔ غالباً شام کے پانچ چھ کا وقت تھا۔ اس نے انگڑائی لی اور بستر سے اتر کر چپل پہن کر بالکونی میں آ گیا۔ سامنے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ غالباً عورت کا شوہر کہیں باہر جا چکا تھا اور عورت بالکونی میں کھڑی ہوئی تھی۔

عورت اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور تندرست و توانا جسم کی مالک تھی۔ بار مردوں کی طرح کٹے ہوئے تھے اور ایک پھول دار فراک زیب تن کئے ہوئی تھی۔ جس کا گلا کافی بڑا تھا۔ سام نے اندازہ لگایا اس کی عمر تیس بتیس سال کے درمیان ہے۔ اس عورت کے جسم کو عجیب نگاہوں سے گھورا۔

”ہیلو!“ عورت نے مسکراتے ہوئے سام کو مخاطب کیا۔ ”مجھے اینگڑ کہتے ہیں“

اڑا رہا تھا۔ جس میں سب سے پیش پیش اینگریڈ تھی اور پھر اس نے سام کی چڑی بنالی۔ وہ جب بھی بالکونی میں کھڑا ہوتا یا اس کی مڈ بھیڑ اینگریڈ سے ہوئی تو وہ اسے مسٹر کاروچ کہہ کر مخاطب کرتی۔ منگل کی رات جب کہ چاند کی تیرہ تاریخ تھی۔ سام بڑے جوش و خروش میں نظر آیا۔ آسمان پر گہرے بادل چھا جانے کی وجہ سے تاریکی گہری تھی اور سمندر خاصا جوش میں نظر آیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طوفان کی آمد آمد ہے۔ تیز ہواؤں کے سبب قصبے کے مکینوں نے سرشام ہی دروازے اور کھڑکیاں بند کر لی تھیں۔

مقامی گرجا کے گھنٹے نے بارہ بجائے تو سام خاموشی سے اپنے بستر سے اٹھا۔ اس نے کمرے کے وسط میں کسی گلابی رنگ سے ایک شش پہلا ستارہ بنایا اور پھر اس میں بیٹھ گیا۔ اس کا منہ مسلسل چل رہا تھا جیسے وہ کسی چیز کا درد کر رہا ہو۔ کمرے میں کم پاور کا بلب روشن تھا۔ جس کی وجہ سے کمرے کا ماحول عجیب سا ہو رہا تھا۔

دفعاً سرسراہٹوں کی آوازیں بلند ہوئیں لیکن ان سے بے نیاز سام کے ہونٹ ہلے رہے۔ پھر کمرے کے ایک کونے میں ایک کاروچ نمودار ہوا اور یکے بعد دیگرے کاروچوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ حتیٰ کہ پورا کمرہ ان سے بھر گیا۔ صرف وہ کشید کیا ہوا ستارہ جس میں سام بیٹھا تھا کاروچوں کے چھوٹے چھوٹے وجود سے پاک تھا۔

اچانک سام نے اپنے داہنے ہاتھ کی درمیانی انگلی اٹھائی اور کھلے ہوئے دروازے کے باہر بالکونی کی طرف کر دی۔ اس کی انگلی کا رخ آہستہ آہستہ سامنے والے فلیٹ کی طرف ہو گیا۔ جہاں ہارڈی اور اینگریڈ محو خواب تھے۔

کاروچوں نے یکبارگی اپنے منہ اوپر اٹھائے اور سونڈیں ہلاتے ہوئے بالکونی کی طرف لپکے۔

اگلی صبح وہ کافی دیر تک سوئے لیکن دروازے پر پڑنے والی دستک نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ سام نے جھنجھلا کر پچل پنے اور جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے پولیس کا ایک آفیسر کھڑا تھا۔

”فرمائیے آفیسر!“ سام نے کہا۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”کیا آپ مسٹر ہارڈی اور مسز ہارڈی کی اندوہناک موت کے سلسلے میں کوئی بیان

لکھ سکا تھا۔ اس کے پڑوس سے یا تو چیخنے چلانے کی صدا آئی رہیں یا پھر ہارڈی کے جانے کے بعد اس بد ذات عورت نے تیز آواز میں ریڈیو بجانا شروع کر دیا تھا۔

تیسرے دن اس نے اینگریڈ کو تنہا دیکھ کر اپنی بالکونی میں کھڑے ہوئے اس کی حرکات پر احتجاج کیا۔

”تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟“ اس نے قدرے تیز آواز میں جواب دیا۔ ”تم سے بہتر تو لائپوں سے مچھلی اتارنے والے نگرولڑکے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے بالکونی میں رکھے ہوئے ریڈیو کی آواز بلند کر دی۔

وہ رات بھی سام پر گراں گزر رہی تھی۔ ہارڈی سرشام اپنے فلیٹ میں آچکا تھا اور رات ایک بجے تک ان کے فلیٹ سے بے ہنگم آوازیں نشر ہوتی رہیں۔

رات گئے جب یہ اودھم چوکڑی بند ہوئی تو سام بالکونی میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ گئے اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ بدبوائے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے دونوں ہاتھ گرا لئے اور داہنے ہاتھ سے سینے پر کراس کا نشان بنایا یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے شر سے بچنے کے لئے خدا سے دعا مانگ رہا تھا۔

غالباً رات کے تین بجے ہوں گے کہ کسی سرسراہٹ کی آواز نے اس کی آنکھ کھول دی۔ سام چند لمحے بستر پر پڑا ان نامعلوم سرسراہٹوں کو سنتا رہا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اور اس کا چہرہ کسی بھی جذبات سے عاری نظر آ رہا تھا۔ بغیر کوئی آواز پیدا کئے وہ آہستہ سے اپنے بستر سے اترتا اور قدم سنہال سنہال کر دیوار کی طرف بڑھا۔ جہاں سوچ بورڈ آویزاں تھا۔ اسے آویزاں ہی کہاں جاسکتا تھا کیونکہ وہ دیوار پر لٹک رہا تھا۔

بجلی کا سوچ کھناک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ آن ہوا اور کمرہ بلب کی روشنی میں نما گیا۔

سام نے دیکھا کہ کمرے کی دیواروں اور چھت پر ہزاروں کی تعداد میں کاروچ چپکے ہوئے اپنی لمبی لمبی سونڈیں ہلا رہے تھے۔ کمرے میں سنائی دینے والی ہلکی ہلکی سرسراہٹیں انہی کی حرکت سے پیدا ہو رہی تھیں۔

اگلی صبح جب اس نے مکینوں کو کاروچوں کے بارے میں بتایا تو ہر فرد اس کا مذاق



دیں گے؟“

”کیا؟“ سام نے کہا۔ ”کیا مسٹر ہارڈی اور مسز ہارڈی کا انتقال ہو گیا؟“ اس کے لیے سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

”خدا کی پناہ!“ پولیس آفیسر حیرت سے منہ پھاڑتے ہوئے بولا۔ ”رات تین اور چار بجے کے درمیان ان دونوں میاں بیوی کی چیخوں سے ارد گرد کے تمام لوگ جاگ اٹھے تھے اور آپ ایسی نیند سوتے ہیں کہ آپ کو کچھ معلوم نہیں۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا آفیسر!“ سام نے کہا۔ ”کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“

”میاں بیوی کی کربناک چیخیں سن کر جب پڑوس کے لوگ مسٹر ہارڈی کے فلیٹ پر پہنچے تو دروازہ اندر سے بند تھا اور ان لوگوں کی کربناک کراہیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ چند باہمت لوگوں نے دروازہ توڑا تو ایک خوفناک منظر نظر آیا لاکھوں کاکروچ مسٹر ہارڈی اور مسز ہارڈی کو لپٹے ہوئے تھے اور وہ دونوں بری طرح تڑپ رہے تھے۔ ان کے جسموں سے خون نکل کر بستر اور فرش پر پھیل چکا تھا۔ بہر حال انہوں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور پولیس کو اطلاع دی۔ جب ہم لوگ پہنچے تو وہ منخوس کاکروچ مسٹر ہارڈی اور اس کی بیوی کے جسموں کا ایک ایک ریشہ چٹ کر کے دفغان ہو چکے تھے۔ وہاں البتہ ہڈیوں کے دو ڈھانچے ضرور پڑے تھے۔“ یہ کہہ کر آفیسر نے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا۔ غالباً اس منظر کا خیال کر کے اس کی پیشانی تر ہو گئی تھی۔

اگلے چند دن سام بہت مصروف رہا۔ اس کا زیادہ وقت کمرے کی میز پر کچھ لکھنے میں صرف ہوتا رہا۔ ویک اینڈ پر اس نے اپنا ایڈجی کیس اٹھایا اور فلیٹ سے باہر نکل آیا۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ فلیٹ کے مالک نے اسے آواز دی۔

”مسٹر سام! کیا آپ جارہے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔ میں پیراماؤنٹ سٹی جا رہا ہوں۔ ایک نئی کہانی کے لئے کچھ تیاری کرنا ہے۔“ سام نے جواب دیا۔ ”غالباً پیراماؤنٹ سٹی کی بس دس بجے ملے گی۔ بہر حال ابھی پندرہ منٹ ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ قصبے کی واحد سڑک جو بڑی شاہراہ کی طرف جاتی تھی چل

دیا۔

”خدا حافظ! امید ہے کہ آپ جب یہاں آئیں گے تو ہماری سروس کو نہیں بھولیں گے۔“ ادھیڑ عمر مالک مکان نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے الوداع کیا۔

”بڑی شاہراہ پر پہنچ کر سام بڑبڑایا۔ ”گزشتہ کہانیوں کی بہ نسبت اس مرتبہ کی کہانی بہت بہتر ہو گئی ہے اور امید ہے کہ ایڈیٹر ایک معقول رقم کا چیک بھیجے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے کوٹ کی جیب میں رکھے ہوئے اس لفافے کو ہتھپیٹا جس میں کہانی کا مسودہ تھا۔ ”کہانیاں میز پر بیٹھ کر نہیں لکھی جاتیں اس کے لئے کچھ سیکھنا اور کچھ عملی طور پر بھی کرنا پڑتا ہے۔“ اس نے خود کلامی کی۔

دور شاہراہ پر ایک بس کا ہیولہ چکا اور سام اپنا ایڈجی کیس پکڑے اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔

○☆○

بنجور کے اس جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے اس قصبہ میں سیاحوں کی خاص آمدورفت رہتی ہے۔ پرانی وضع کی حویلی نما عمارتیں اور قلعہ نما سرائیں ان کی توجہ فوراً اپنی طرف مبذول کرا لیتی ہیں۔ ان میں سے ایک سرائے خاص طور پر بہت مشہور ہے، جو شاہی سرائے کہلاتی ہے اور سڑک کے بالکل کنارے واقع ہے۔ قدرے بلندی پر ہونے کی وجہ سے اور اپنی سرخ رنگ کی عمارت کے سبب یہ سرائے بنجور میں داخل ہونے والوں کو دور ہی سے نظر آتی ہے۔

بنجور کے متعلق یہ سب کچھ میں نے پہلے سے سن رکھا تھا لیکن اس وقت بنجور کی میر میرے پروگرام میں شامل نہیں تھی۔ میں تو اپنے سرکاری کام کے سلسلے میں جلد سے جلد سر مور پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن برا ہو بارش کا کہ اس نے میرا پروگرام خراب کر دیا۔ بارش کے ساتھ تیز ہوا بھی چلنے لگی تھی جس سے موسم میں ناقابل برداشت حد تک خنکی آگئی تھی۔ سامنے کچھ دور شاہی سرائے کی سرخ سرخ عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ میں آگے جانے کا ارادہ مجبوراً ملتوی کر کے سیدھا اس سرائے کی طرف بڑھ گیا۔

گاڑی برآمدے میں ایک طرف کھڑی کر کے میں گاڑی سے نکلا تو سرائے کے مالک نے آگے بڑھ کر میرا خیر مقدم کیا۔ ایک نوکر میرا سامان ڈکی سے نکال کر اندر لے گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں سرائے کے ہال میں ایک میز کرسی پر بیٹھا گرم گرم کھانے کا لطفہ اٹھا رہا تھا۔ اس گرم گرم کھانے کے ساتھ ٹھنڈی میٹھی بخ بستہ فیرنی بھی تھی۔ جب میرا فیرنی کا پیالہ لے کر آیا تو میں نے دیکھا کہ اس میں ایک طرف ایک چھوٹا سا گڑھا پڑا ہوا ہے۔ جیسے کسی نے اس میں اپنا انگوٹھا ٹھونس دیا ہو۔ جب میں نے میرے کو اس طرف مروجہ کیا تو وہ سراپمہ ہو کر بولا۔ ”اوہ جناب! یہ رانی کی شرارت ہے کاش وہ بارچی خانے سے دور ی رہا کرے۔“

”رانی!“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”وہ کون ہے؟“

”وہ..... وہ..... جناب.....“ میرے نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اپنا فقرہ نامکمل ہی چھوڑ کر چلا گیا۔

میرے ذہن میں تجسس کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں نے کھانا ختم کیا اور اس کی قیمت

## بھٹکتی روح

میں ایک سرکاری کام کے سلسلے میں سر مور جا رہا تھا کہ راستے میں بنجور کے قریب بارش نے آلیا۔ بنجور پرانے وقتوں کا ایک قصبہ ہے اور ایسے راستے پر واقع ہے جسے شاہی قافلے صحت افزا پہاڑی مقامات پر جانے کے لئے اختیار کرتے رہے ہیں۔ اس کے ارد گرد کا علاقہ بھی ایک حد تک نیم پہاڑی ہے اور اس نیم پہاڑی علاقے میں ندی، نالے اور غار وغیرہ بڑی کثرت سے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں شاہی وقتوں کے کچھ باغات بھی ہیں جو شالامار باغ کی طرح بڑے خوبصورت ہیں۔ یہ باغ شاید اس خیال سے بنوائے گئے تھے کہ شاہی قافلے کے افراد وہاں کچھ دیر ٹھہر کر سفر کی تھکاوٹ دور کر سکیں اور پھر تازہ دم ہو کر آگے روانہ ہوں۔

ادا کرنے کے بعد سرائے والے سے پوچھا۔ ”کیوں جناب! یہ رانی کون ہے، جو فیٹی کے پیالے میں انگوٹھا ٹھونس رہی ہے؟“ سرائے والے نے پہلے تو حیرانی سے میری طرف دیکھا، پھر سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ”تشریف رکھئے جناب! یہ ایسی بات نہیں، جو دو حرفوں میں بیان کی جاسکے۔“ میں اس کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کہا۔

”لیجئے جناب! اب بتائیے؟“

اور پھر سرائے والے نے مجھے ایک عجیب و غریب داستان سنائی۔

کوئی دو سو سال پہلے کی بات ہے۔ اس سرائے کے احاطے میں ایک بیوہ بھٹیاری رہتی تھی۔ جس کی ایک لڑکی تھی۔ جس کا نام رانی تھا۔ سرائے کے اس وقت کے مالک نے ترس کھاتے ہوئے بھٹیاری اور اس کی بیٹی کو سرائے میں کام پر لگا رکھا تھا۔ بھٹیاری جب فوت ہو گئی تو اس کے بعد بھی سرائے والے نے رانی کو بدستور کام پر لگائے رکھا۔ رانی اپنا کام کچھ ایسی خوبی اور دلچسپی سے کرتی تھی کہ اس نے سرائے والے کو یا سرائے میں آنے والے مسافروں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

رانی جب تک چھوٹی عمر کی تھی، تب تک کسی نے اس کا کوئی خاص خیال نہیں کیا۔ لیکن جب وہ جوانی کی عمر کو پہنچی تو ہر آنے جانے والے مسافروں کی نظریں اس کی طرف اٹھنے لگیں۔ اس کا خوبصورت ناک نقشہ اور دودھ کی طرف سفید رنگت دیکھنے والوں کی نظروں میں کھب کھب جاتی تھیں اور وہ اپنے میلے کچیلے کپڑوں میں بھی ایک رانی معلوم ہوتی تھی۔

رانی کے علاوہ سرائے میں اور بھی دو لڑکیاں تھیں، جو تقریباً رانی کی ہم عمر تھیں۔ سرائے والے نے ان تینوں کو رہنے کے لئے ایک کمرہ دے رکھا تھا۔ رانی کی یہ ساتھی لڑکیاں اکثر اسے چھیڑنے کے لئے کہا کرتیں۔ ”رانی! اس رنگ روپ کے ساتھ تو تجھے یہاں نہیں، کسی محل میں ہونا چاہئے تھا۔“

رانی اپنے مستقبل کے بارے میں، جاگتے میں خواب دیکھنے لگی تھی۔ وہ صرف اس صورت میں ہی پورے ہو سکتے تھے کہ اس کی شادی کسی راجہ یا امیر کبیر جاگیردار، کسی نواب یا نواب زادے سے ہو جائے۔ سرائے میں نوابوں اور جاگیرداروں کی آمد و رفت

بڑی کثرت سے رہتی تھی۔ رئیسوں اور نوابوں کے بے فکرے اور کھنڈے لڑکے بھی اکثر سرائے میں آتے رہتے تھے۔ اپنے مستقبل کو ذہن میں رکھ کر رانی نے ایک منصوبہ بنایا اور پھر اس پر عمل کرنے کے لئے ایسے امیر مسافروں کی تاک میں رہنے لگی جو آسانی سے اس کی محبت کے جال میں پھنس سکیں۔

نوابوں اور جاگیرداروں کے آوارہ مزاج لڑکے تو پہلے ہی رانی سے ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے۔ کچھ دنوں میں ہی ایسا ہوا کہ بیک وقت تین نوجوان رئیس زادے اس سے محبت جتانے لگے اور وہ اپنی سادگی کی بدولت یہ فیصلہ نہ کر پائی کہ ان میں سے کس کو ترجیح دے۔ چنانچہ وہ نادان ان میں سے ہر ایک پر یہی ظاہر کرتی رہی کہ وہ صرف اسی سے پیار کرتی ہے۔

رانی البر اور نادان ہونے کے باوجود ان تینوں رئیس زادوں کو اپنی انگلیوں پر نچا رہی تھی۔ وہ سرائے میں صرف اس کی خاطر آتے تھے اور اس کے لئے طرح طرح کے تحفے لاتے تھے۔ محبت کے اس کھیل نے رانی کو جیسے اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا تھا۔ وہ قدم کہیں رکھتی تھی اور اس کا دھیان کہیں اور ہوتا تھا۔ کئی بار وہ دبلیز سے ٹھوکر کھا جاتی، کئی بار سالن اس کے ہاتھ سے گر جاتا اور اس کے اپنے اور مسافروں کے کپڑے خراب ہو جاتے کئی بار اسے جو کام کہا جاتا، وہ اسے یاد ہی نہ رہتا۔

وہ محبت کے اس انوکھے کھیل میں مگن تھی کہ ایک شام ایک نوجوان گھڑ سوار سرائے میں آیا۔ باہر بڑے زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ نوجوان نے اپنا تھکا ماندہ اور کچھڑا لٹ پت گھوڑا سرائے کے سائیں کے حوالے کیا اور خود سرائے کے کمرے میں آکر بک کرسی میں دھنس گیا۔ گرم گرم قہوہ پی کر اس کے اوسان بجا ہوئے تو اس نے کھانا منب کیا۔

رانی اس کے لئے کھانا لے کر گئی۔ جب وہ اس کی میز پر کھانا چن رہی تھی تو نوان نے مسکراتے ہوئے شرارت بھرے انداز سے اس کی طرف دیکھا۔ رانی اس کی اہوں سے گھبرا سی گئی اور مارے گھبراہٹ کے اس کے ہاتھ کا انگوٹھا فیٹی کے پیالے میں گیا اور فیٹی کا کچھ حصہ نوجوان کے گھسنے پر جاگرا۔ رانی اور بھی گھبرا گئی لیکن وہ نوجوان

غریبی میں امیری کے سنے اور جھوٹوں میں رہ کر مخلوں کے خواب دیکھنے والی معصوم اور سادہ لوح رانی اس جعلی پیغام کے جھانسنے میں آگئی۔ اس نے سرائے کے مالک کی بیوی کے کمرے سے چند ریشمی چادریں اڑائیں اور ان سے اگلے دن کی شام تک مارا مار کر کے ایک خوبصورت عروسی جوڑا تیار کیا۔

سرائے کے اندر سے ایک خفیہ سرنگ سرائے کے پیچھے واقع غار تک جاتی تھی۔ مقررہ وقت پر رانی ایک دلہن کی طرح سج سجا کر سرنگ کے راستے غار میں جا پہنچی۔ وہاں اس کے محبوب اجنبی نوجوان کی بجائے وہ تینوں رئیس زادے موجود تھے۔ جو اب تک اس کے طلب گار تھے۔ انہوں نے کچھ پی بھی رکھی تھی اور نشے میں لڑکھڑاتے ہوئے قہقہے پر قہقہے لگا رہے تھے۔ رانی کو آتے دیکھ کر ایک نے کہا۔ ”لو بھئی! رانی صاحبہ شریف لے آئی ہیں۔“

دوسرے نے جھوٹے ہوئے کہا۔ ”ارے رانی نہیں، مہارانی کو، مہارانی! آئیے پجور کی مہارانی صاحبہ! یہ محل تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

رانی کو فوراً معلوم ہو گیا کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے اور یہ دھوکہ کرنے والے یہی تینوں رئیس زادے ہیں۔ اس نے ان تینوں کو برا سخت ست کہا اور انہیں زہلی اور کمینگی کے طعنے دیئے لیکن وہ رانی کے طعنوں کو سن کر برابر ہنستے اور قہقہے لگاتے رہے۔

پھر جب رانی واپس جانے کے لئے مڑی تو انہوں نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا۔ وہ اس کے بدن پر چٹکیاں لینے اور اس کے بازو پکڑ کر اسے لٹو کی طرح گھمانے لگے۔ رانی نے نا پر بڑی لاتیں چلائیں، اپنے ناخنوں سے ان کے منہ نوچنے کی کوشش کی اور خود کو ان کے پنجے سے آزاد کرنے کی زبردست جدوجہد کی۔ اس کش مکش میں وہ گر پڑی اور اس کا رخسار کی دیوار سے جا ٹکرایا، جس سے وہ بے ہوش ہو گئی۔

رانی کو بے ہوش دیکھ کر تینوں رئیس زادوں کے جیسے ہوش اڑ گئے۔ وہ اس حد تک جانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ تو محض مذاق کرنے اور رانی کو ذرا بے وقوف لانے کا تھا۔ خوفزدہ سے ہو کر وہ رانی کو اٹھا کر سرنگ کے راستے دوبارہ سرائے میں لے

صرف قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ سرائے والا رانی کی گھبراہٹ اور سراسیمگی دیکھ چکا تھا۔ اس نے آکر رانی کے کان اٹھائے اور پھر نوجوان سے معذرت کرنے لگا۔ رانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اجنبی نوجوان کچھ دیر سرائے میں ٹھہر کر واپس چلا گیا لیکن اگلی شام وہ پھر آیا اور پھر ایک ماہ تک ہر دوسرے تیسرے روز آتا رہا۔ ہر روز اس کی نگاہیں رانی کو ڈھونڈتی تھیں۔ جب وہ اس کے لئے کھانا لے کر آتی تو وہ اسے اپنے ہنسی مذاق سے کبھی شرمائے اور کبھی ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتا تھا۔

اجنبی نوجوان نے ابھی تک اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا تھا لیکن اس کے قیمتی لباس اور عمدہ گھوڑے کو دیکھ کر بڑی آسانی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ یا تو کوئی جاگیردار ہے یا پھر تاجروں کے قافلے لوٹنے والا ڈاکو ہے۔ رانی پہلے خیال کو ترجیح دیتی تھی اور اب وہ ہر گھڑی اس کے خیالوں میں مگن رہنے لگی تھی۔

وہ تینوں رئیس زادے جو صرف رانی کی خاطر سرائے میں آتے تھے، رانی کو اور اجنبی نوجوان کے آگے پیچھے پھرتے دیکھ کر غصے سے بیچ و تاب کھاتے رہتے تھے لیکن کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ رانی اب پہلے کی طرف ان پر توجہ بھی نہیں دیتی تھی۔

رانی کے معاملے میں وہ اب تک ایک دوسرے کے دشمن بنے رہے تھے، لیکن اجنبی نوجوان کی آمد نے انہیں یکجا کر دیا اور جب رانی انہیں بالکل نظر انداز کرنے لگی انہوں نے آپس میں صلاح و مشورہ کر کے اسے ایک ایسا سبق سکھانے کا فیصلہ کیا، جسے ساری زندگی نہ بھولے۔

انہوں نے ایک لڑکے کو گانٹھا اور اس کے ہاتھ رانی کو ایک پیغام بھجوایا۔ بظاہر پیغام اس اجنبی نوجوان کی طرف سے تھا۔ لڑکے نے کہا۔

”اس نے کہا ہے کہ میں ایک معزز جاگیردار ہوں اور تمہیں اپنی بیوی بنانا چاہیے۔ تم کل رات کا ایک پہر گزرنے کے بعد مجھے سرائے کے پیچھے والے غار کے باہر ملو۔ اگر تم اچھا سا عروسی جوڑا پن کر آ جاؤ تو ہم اسی وقت ہی شادی کا بندوبست کر دے گے۔“

خوبصورت عورت کو دیکھا ہے جو سر سے پاؤں تک قیمتی زیورات اور ہیرے جواہرات سے لدی پھندی نظر آتی ہے اور اس کے سر پر ایک خوبصورت تاج جگمگا رہا ہے۔ دوسرے کا کہنا ہے کہ وہ کچھ عجیب سی چیز دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس کمرے میں کوئی آرام اور سکون سے نہیں رہ سکتا۔ میں نے آپ کو آگاہ کر دیا ہے۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔“

اس گفتگو کے کچھ دیر بعد ہی میں اس کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ جس کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ رانی وہاں اس دنیا سے رخصت ہوئی تھی۔ بستر میں لیٹ کر میں کچھ دیر تک تو ایک کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا پھر جب مجھے نیند آنے لگی، تو میں نے ہاتھ بڑھا کر بتی بجھادی اور چند منٹ بعد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے اپنے ماتھے پر ایک سرد سرد ہاتھ محسوس ہوا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو چیخ مار کر باہر کی طرف بھاگ نکلتا، لیکن مجھے اپنی زندگی میں اس قسم کے بہت سے پراسرار واقعات سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر بتی روشن کر دی اور گرد و پیش دیکھا۔ کمرے میں کوئی شخص نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور میری پیشانی پر بھی کوئی چیز نہیں تھی۔

میں بتی بجھا کر دوبارہ لیٹ گیا۔ لیٹا ہی تھا کہ پھر مجھے اپنی پیشانی پر ایک سرد سرد ہاتھ محسوس ہوا۔ ایسا ایک دو بار ہوا۔ سرد ہاتھ، بتی جلاؤ اور سرد ہاتھ غائب۔ بتی بجھاؤ سرد ہاتھ پھر موجود۔ آخر بڑی دیر بعد میں اس سرد ہاتھ کا پیغام سمجھ گیا۔ کوئی ہستی یہ چاہتی تھی کہ میں جاگتا رہوں لیکن بتی جلا کر نہیں، اندھیرے میں۔ میں نے بتی بجھادی۔ اٹھ کر بیٹھ لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

تقریباً اسی وقت کمرے کے قریب فرش سے کوئی تین فٹ کی اونچائی پر روشنی کی کرن نمودار ہوئی۔ یوں لگتا تھا جیسے روشنی کی یہ کرن دروازے کے کسی سوراخ میں آ رہی ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کرن نے پھیلانا شروع کر دیا۔ اس کی جسامت اور مکی چمک دمک بڑھنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے ایک دھندلے سے بیولے کی مانند اختیار کر لی۔ اس کی چمک ہیرے کی سی چمک تھی۔ شاید یہ شاہی سرائے کی رانی کا

آئے اور اسے اس کے کمرے میں لا کر اس کے بستر پر لٹانے کے بعد خاموشی کے ساتھ سرائے سے کھسک گئے۔

صبح کے وقت دوسری دو لڑکیوں نے رانی کو دیکھا تو وہ دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ کو تو ال کو خبر ہوئی تو وہ سپاہیوں کے ساتھ آیا۔ تینوں رئیس زادوں نے تمام واقعہ بیان کر ڈالا۔ جب رانی کے جسم کا معائنہ کیا گیا تو اس پر کوئی ایسی بھاری چوٹ یا زخم کا کوئی نشان نہ تھا جس سے یہ سرائے قائم کی جاسکتی کہ رانی کی موت کسی چوٹ یا زخم کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس لئے یہی سمجھ لیا گیا کہ رانی کی موت ذلت اور بے عزتی کے احساس اور دل ٹوٹ جانے کی بدولت واقع ہوئی ہے اور اس طرح قانون کی نظروں میں یہ معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔

”حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اجنبی نوجوان اور اس کا خوبصورت گھوڑا پھر کبھی وہاں دیکھنے میں نہ آیا۔ جس کے باعث رانی اپنے اس دردناک انجام کو پہنچی تھی لیکن اس کے کفن دفن کے چند روز بعد ہی ان دو لڑکیوں نے جو اب تک رانی کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہتی آئی تھیں وہ کمرہ چھوڑ دیا۔ اس کمرے میں عجیب و غریب اور پراسرار حرکات ہوتی محسوس ہونے لگی تھیں اور انہیں وہاں رہتے ہوئے اپنی جان خطرے میں نظر آتی تھی۔“

رانی کی یہ داستان سنا کر سرائے والے نے ایک لمبا گہرا سانس لیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”کیا میں اس کمرے میں رات گزار سکتا ہوں۔“

سرائے والے نے میری طرف یوں دیکھا، جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر وہ کہنے لگا کیا ضرورت ہے آپ کو وہاں جانے کی۔ ہمارے پاس دوسرے کمرے موجود ہیں۔ اس کمرے میں تو میرا کتا بھی قدم نہیں رکھتا اور آج اگر فیرنی کے پیالے میں رانی نے انگوٹھا ٹھونس دیا تھا تو پھر وہ اپنے کمرے میں بھی موجود ہوگی۔“

”میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہاں کیا کچھ پیش آتا ہے۔“

سرائے والے نے یہ سن کر اپنے شانے اچکائے اور کہنے لگا۔ ”اس کے بارے میں یقین سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ بعض کا کہنا ہے کہ انہوں نے ایک نوجوان اور

اور سر پر تاج سجائے مہارانی کیوں نہیں نظر آئی؟

پھر میں نے سوچا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے گھر میں کسی کو کوئی پریشانی ہو اور قدرت اس طرح یہ بات مجھ تک پہنچانا چاہتی ہو۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ڈھائی بج رہے تھے۔ میں اپنے گھر کے بارے میں سوچنے لگا جو اس جگہ سے سینکڑوں میل دور تھا۔ جہاں میری بیوی کے پاس سوائے ایک ننھے شیرخوار بچے کے اور کوئی نہ تھا۔

میں انہی خیالوں میں کھویا بستر میں بیٹا صبح کا انتظار کرتا رہا۔ ناشتے کا وقت ہونے سے پہلے ہی میں لباس وغیرہ بدل کر وہاں سے جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

”کیسے جناب! آپ نے رانی کو دیکھا؟“ سرائے والے نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اسے ساری سرگزشت سنا ڈالی۔ وہ سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

”وہ رانی ہی تھی جناب! کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی روح اب تک اپنے اجنبی محبوب کو تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ لیکن دوسروں کا کہنا ہے کہ وہ ان رئیس زادوں کی تلاش میں ہے جو اس کی موت کا باعث بنے۔ وہ سب لوگ کب کے مر کپ چکے لیکن رانی کی روح اب تک اسی طرح بے چینی سے بھٹکتی پھر رہی ہے۔ میری بیوی نے کئی بار کہا کہ کسی عامل کو بلا کر رانی کی روح کو یہاں سے نکلوا دیا جائے لیکن میں اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ آپ جانیں بہت سے لوگ اس سرائے میں صرف اس لئے آتے ہیں کہ رانی کی روح کو دیکھیں کیا آپ سرمور سے واپسی پر یہاں ٹھہریں گے جناب؟“

”یقیناً، یقیناً!“ میں نے بے خوفی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

لیکن چند روز بعد جب میں سرمور سے واپس آتے ہوئے پنپور سے گزرا تو مجھے توقع کے کہیں زیادہ دیر ہو چکی تھی اور میری مصروفیات مجھے کہیں رکنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ شاہی سرائے کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر گاڑی کا ہارن بجاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

بظاہر شاہی سرائے کی رانی کی یہ کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن نہیں کچھ دنوں بعد جب میں اپنے گھر پہنچا تو اس کہانی کا ایک اور عجیب اور پراسرار رخ میرے سامنے آیا۔ میری بیوی نے بڑے جوش سے مجھے بتایا۔

ہیولا تھا۔ یہ ہیولا تقریباً دو فٹ چوڑا اور چار فٹ اونچا ہو چکا تھا اور دروازے کے قریب ہی معلق حالت میں منڈلا رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر بتی جلا دی۔ کمرے میں کوئی نئی بات نظر نہیں آتی تھی۔ ہر شے پہلے کی طرح تھی۔ دھندلے اور چمکدار ہیولے کا کوئی نشان نہ تھا۔ میں نے بتی گل کر دی۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ دھندلا ہیولا پھر نمودار ہو گیا۔

میں نے اپنے جسم پر سے چادر ایک طرف پھینکی اور بستر سے نکل کر کتاب ہاتھ میں دبائے دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھے یقین تھا کہ باہر برآمدے میں کوئی شخص کھڑا یہ ٹانگ رچا رہا ہے اور مجھے خوفزدہ کرنا چاہتا ہے لیکن میں اس طرح خوفزدہ ہونے والا نہیں تھا۔

دروازے سے چند قدم ادھر ہی اچانک مجھے یوں لگا جیسے میں انتہائی شدت کی سردی کے حلقے میں آ داخل ہوا ہوں۔ میرا سانس پھول گیا۔ ہاتھ پاؤں بھاری ہو گئے۔ سارا جسم پتھر کی طرح سن اور برف کی طرح بج ہوتا محسوس ہونے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ آیا مجھ پر یک بیک دل کی بیماری کا حملہ ہو گیا ہے یا میں خوف کا شکار ہوتا جا رہا ہوں؟

پھر سردی کے اس حلقے میں کڑے ہوئے میرے ذہن پر مایوسی کے شدید قسم کے جذبات چھانے لگے۔ میں سوچنے لگا یہ زندگی بیکار ہے۔ اس کا حاصل غموں کے سوا کچھ نہیں اور یہ سوچتے ہوئے یکایک میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ بیماری رانی نے بھی کچھ ایسے ہی سوچا ہو گا۔ کوئی نہ تھا جو اس کی حمایت میں اٹھتا اور اس کی عزت آبرو کی حفاظت کرتا۔

روشنی کا دھندلا ہیولا مجھے اپنے سامنے نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی رانی کے بارے میں ہمدردانہ خیال میرے دماغ میں آیا اس ہیولے میں حرکت ہوئی اور وہ ایک دم میری طرف بڑھا۔ میں نے تیزی کے ساتھ پیچھے کی طرف جست لگائی۔ بستر میں کودا اور جھٹ بتی جلا دی۔

پھر میں نے سوچنے کی کوشش کی۔ یہ ہیولا مجھے اس وجہ سے نظر آیا تھا کہ مجھے اس کے متعلق پہلے سے بتایا گیا تھا۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو پھر ایک بے ہیئت اور سرد سرد ہیولے کے بجائے مجھے سر سے پاؤں تک زیورات اور ہیرے جواہرات سے لدی پھدی